Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا علمبردار

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1964

تکذیب دین کون کرتا ہے؟

ارءیت الذی یکذب بالدین ۔ فذالک الذی یدع الیتیم ولا یحض علی طعام المسکین ۔ فویل للمصلین الذین ھم عن صلاتھم ساھون ۔ الذین ھم یراؤن و یمنعون الماعون ۔ (الماعون)

کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کو جھٹلاتا ہے ؟ یہ وہ ہے جو معاشرہ میں بے سہارا لوگوں کو دھتکارتا ہے ۔ اور جن لوگوں کا کاروبار کسی وجہ سے رک گیا ہو' ان کی روٹی (کا انتظام نہ خود کرتا ہے نہ) دوسروں کو اسکی تاکید کرتا ہے ۔ پس بربادی ہے ان نمازیوں کی جو (اس قسم کی روش اختیار کرتے ہیں اور) نماز کی غرض و غایت سے بے خبر رہتے ہیں اور محض دکھاوے کی نمازیں پڑھتے رہتے ہیں ۔ ان کی حالت یہ ہے کہ زندگی کی ضروریات کی ان چیزوں کو جنہیں اپنے پاس کیطرح ہر ایک کے لئے عام ہونا چاہیے' روک رکھتے ہیں (اور لوگ محتاجی کی زندگی بسر کرتے ہیں) ۔

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ۔ ایک روپیہ

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک

پاک و ہند سے سالانہ ــــ دس روپے

غیر ممالک سے سالانہ ــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاک و ہند سے

ایک روپیہ

ٹیلیفون نمبر ۸۰۸۰۰

خط و کتابت کا پتہ

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۔ لاہور

جلد ۱۷ — اکتوبر ۱۹۶۴ء — شمارہ نمبر ۱۰

فہرست مضامین

لمعات		۲
معرکۂ دین و وطن	(محترم پرویز صاحب)	۹
ایک ضروری اعلان		۳۳
پاکستان کا مستقبل		۳۴
مسلم پرسنل لاء پر ایک نظر		۵۹
کیا خدا عادل ہے		۶۵
باب المراسلات		۷۱
(۱) زمانے کے تقاضے		
(۲) عالم کسے کہتے ہیں		
(۳) اسلامک سوشلزم		
حقائق و عبر		۷۸
بقیہ حقائق و عبر		۳۲
بقیہ لمعات		۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

دگر از سر گرفتم قصۂ زلف چلیپا را

قوموں کی تاسیس، تشکیل، استحکام، زندگی اور ارتقاء میں تعلیم کا کس قدر حصہ ہے، اس کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ گذشتہ سترہ سال سے، طلوع اسلام میں اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ وہ اس بنیادی مسئلہ کی اہمیت اجاگر کرنے کے لئے کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی قوم وہ کچھ بن ہی نہیں سکتی جو کچھ آپ اسے بنانا چاہتے ہیں جب تک آپ اس کی آنے والی نسلوں کے دل و دماغ کی تعمیر و تربیت ان خطوط پر نہ کریں۔ کوئی ملک زرعی، صنعتی، معاشی، حتیٰ کہ دفاعی (اور دیگر اسی قسم کے اہم امور مملکت) میں کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے، وہ من حیث القوم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک اس کی نئی نسل کی تعلیم صحیح خطوط پر نہ ہو۔ پھر، ایک نوزائیدہ مملکت کے لئے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جن لوگوں کی شدت آرزو اور عملی اقدامات نے اس مملکت کو حاصل کیا تھا، وہ آہستہ آہستہ یا تو عمر رسیدہ ہو کر چل بستے ہیں اور یا ان کے جذبات میں وہ شدت باقی نہیں رہتی۔ اس کے بعد اس مملکت کے استحکام و بقا کا انحصار آنے والی نسلوں پر ہوتا ہے۔ اگر ان کے دل میں اس مملکت کی سالمیت، بقا اور ترقی کے جذبات ایک زندہ حقیقت بن کر نہ ابھریں، تو وہ اس کی خاطر کسی قسم کی قربانی تو ایک طرف، تھوڑی سی محنت و مشقت کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں گے۔ اُن کی حالت اُس نازپروردہ بچے کی سی ہوتی ہے جس کا باپ بہت سی جائیداد ورثہ میں چھوڑ گیا ہو۔ چند ہی دنوں کے بعد اس جائیداد اور خود اس بچے کا جو حشر ہوتا ہے وہ کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں۔ ہر ایک اس سے واقف ہے۔

اور اگر اس نوزائیدہ مملکت کی بنیاد کسی آئیڈیالوجی پر ہو، اور اس کی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت میں اس آئیڈیالوجی کو کوئی دخل نہ ہو، تو پھر اس مملکت کی صلاح و بہبود، اور اس کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی کے لئے کسی نجومی کی ضرورت نہیں پڑتی - آئیڈیالوجی ایمان ہی کا دوسرا نام ہے - اور ایمان کہتے ہیں، کسی بات کی صداقت کو، دل و دماغ کے پورے یقین کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت تسلیم کرنا - ایمان کوئی جبلّی جذبہ تو ہوتا نہیں جو ہر ذی حیات میں پیدائش کے ساتھ موجود ہوتا ہے - اسے تعلیم و تربیت سے پیدا کرنا پڑتا ہے - اب ظاہر ہے کہ اگر اس مملکت کی نوزائیدہ نسلوں کے دل و دماغ میں اس قسم کا ایمان پیدا نہ کیا جائے، تو وہ مملکت اس آئیڈیالوجی کا پیکر بن کیسے سکتی ہے؟ ہم نے مطالبہ (تحریک) پاکستان کی بنیاد اس دعوے پر رکھی (اور ہمارا یہ دعوےٰ قرآن کی صحیح تعلیم پر مبنی تھا) کہ اسلام میں قومیت کی تشکیل، وطن کی نسبت سے نہیں ہوتی - آئیڈیالوجی کے اشتراک سے ہوتی ہے - لہذا، جس جذبہ (یعنی وطن پرستی) کی بناء پر دیگر اقوام، افراد مملکت کے دل میں، مملکت سے محبت اور اس کی خاطر ایثار کے ولولے بیدار کرتی ہیں، اس جذبہ کو ہم نے پہلے ہی مسترد کر دیا - اور جس جذبہ (یعنی آئیڈیالوجی) کو ہم نے اپنی مملکت کی تشکیل کی بنیاد، بلکہ وجہِ جواز قرار دیا تھا، اس سے آنے والی نسلوں کو بیگانہ رکھا، ہماری اس مجرمانہ غفلت شعاری کا نتیجہ بالکل واضح اور مبین ہے —— ہم نے اپنی نوزائیدہ نسلوں کو اس آئیڈیالوجی سے بیگانہ ہی نہیں رکھا، بلکہ اس آئیڈیالوجی کے خلاف جذبات ابھارنے والے عناصر کو کھلی چھٹی دے کر، ملک میں ایسی فضا پیدا کر دی جس سے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اس آئیڈیالوجی کے خلاف سرکشی، اور مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت (پاکستان) کی وجہِ جواز کے متعلق شکوک و شبہات کے جذبات عام ہو گئے - ہم اس وقت اسی مقام پر کھڑے ہیں -

جب ملک کے سنجیدہ اور دردمند طبقہ کی طرف سے، اس آئیڈیالوجی کی تعلیم کا تقاضا شدّ و مد سے پیش ہونا شروع ہوا تو ہمارے (تعلیم سے متعلق) ارباب بست و کشاد بھی خواب سے بیدار ہوئے —— لیکن اس طرح جیسے وہ بچہ چارپائی سے اٹھتا ہے جسے اسکول بھیجنے کے لئے صبح ہی صبح جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگایا جائے - وہ اٹھنے کو تو اٹھ بیٹھتا ہے لیکن اس کے دل میں جو کچھ گزرتی ہے اس کا کسے اندازہ نہیں؟ یہ حضرات اٹھ کر بیٹھے اور لگے سوچنے کہ اس آفت کو ٹالا کیسے جائے؟ آفتوں کو ٹالنے والی تراکیب ہمارے ہاں بہت آسان ہیں - آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر دکاندار دکان کی چوکھٹ پر ایک تعویذ لٹکا چھوڑتے ہیں - وہ تعویذ ہوتا ہی اس لئے ہے کہ دوکان اور دوکاندار، جملہ آفات و بلیات سے محفوظ رہے - چنانچہ ہمارے شعبۂ تعلیمات نے بھی اسی قسم کا ایک تعویذ لکھایا اور اسے محکمہ کے دروازے کی چوکھٹ پر آویزاں کر دیا - اس تعویذ کا نام ہے —— شعبۂ اسلامیات —— یہ شعبہ، پہلی جماعت سے، ایم. اے تک ساتھ ساتھ چلتا ہے - پہلی جماعت سے ساتویں جماعت تک، اسکولوں میں "اسلامی تعلیم" (یعنی وہ تعلیم جس کے بازو پر

وہ تعویذ باندھ دیا جاتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) لازمی ہے - نویں جماعت سے بی۔ اے تک اختیاری - پھر ایم۔ اے میں بھی یہ مضمون اختیاری ہے - لیکن وہاں "ریسرچ" کا اضافہ کر دیا جاتا ہے - ان طالب علموں کو اسلام کی تعلیم کیا دی جاتی ہے، اسے معلوم کرنے کے لئے آپ کے پاس اتنا وقت کہاں ہوگا کہ آپ ان کے نصاب پر ایک نظر ڈالیں۔ لیکن آپ کے بچے تو اسکول (اور کالج) جاتے ہوں گے - ان میں سے کسی سے اسلام کے متعلق دو چار سوال کیجئے - ان سوالات کے جوابات آپ کو خود بتا دیں گے کہ ان بچوں کو اسلام کے نام سے کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے - ہمارے ہاں (کم از کم ملک کے ہوشمند - تعلیم یافتہ طبقہ میں) ہر جگہ یہ رونا رویا جاتا ہے کہ قوم کو "مولوی" نے تباہ کر دیا ہے - وہ لوگوں کو اس قسم کی تعلیم دیتا، اور تلقین کرتا ہے جس سے وہ، انسانیت کی سطح تو خیر بہت بلند ہے، آدمیت کی سطح پر بھی نہیں پہنچ سکتے - انہیں چند بے روح عقائد - چند بے جان رسوم اور سینکڑوں قسم کی توہم پرستیوں کے الجھاؤ میں الجھا کر، عقل و فکر کا دشمن، علم و بصیرت کا حریف - ہر قسم کی ترقی کے راستے میں سنگ گراں - اور دھرتی کے سینے پر بوجھ بنا کر رکھ دیا جاتا ہے - پہلے یہ تعلیم مولوی تک محدود تھی - اب یہی تعلیم اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ اس تعلیم کے حاصل کرنے والے کو پہلے مولوی کہا جاتا (اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا) تھا - اب انہیں اسلامیات کے گریجویٹ اور ریسرچ اسکالرز کہہ کر پکارا جاتا ہے - پہلے ان کا گزارہ محلے کی روٹیوں پر ہوتا تھا - اب یہ پروفیسر کہلاتے، اور اچھا مشاہرہ پاتے ہیں — اور یہی چیز اس تعلیم کے لئے وجہ کشش ہے - باقی مضامین کے مقابلہ میں، اسلامیات میں ایم۔ اے کر لینا آسان بھی ہے، اور ملازمت بھی نسبتاً آسانی سے مل جاتی ہے - اس "اسلامیات" سے قوم کی نئی نسلوں کی عجیب کیفیت ہو رہی ہے - اس حقیقت کا ہر ایک کو اعتراف ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان، مذہب سے اس لئے دور بھاگتا تھا کہ اس کی تعلیم علم و بصیرت کے خلاف جاتی تھی - وہ پہلے اس کا مضحکہ اڑاتا تھا اور پھر اس سے سرکشی اختیار کر لیتا تھا - لیکن اُس وقت مذہب کی یہ باتیں اس کے کان میں یونہی اڑتے اڑتے پہنچ پاتی تھیں اور سمجھدار ماں باپ، بچے کو دین کی ایسی تعلیم دے سکتے تھے جس سے اس کی نگاہوں میں دین کا احترام پیدا ہو - لیکن اب مشکل یہ ہے کہ ہر بچے کو مڈل کے درجے تک لازماً "مذہب" کی تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے - اگر سمجھدار گھروں میں، ان خرافات کی تردید کر کے بچے کو دین کی صحیح تعلیم دی جائے تو اس کے لئے ایک اور دشواری پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ وہ کلاس میں استاد کے سامنے، اور پھر امتحان میں، سوالات کا وہ جواب دے جو اُسے اسکول میں پڑھایا جاتا ہے، یا وہ جس کی تعلیم اسے گھر پر ملتی ہے - اگر وہ استاد کے سامنے عقل و ہوش کی رُو سے جواب دے تو بچارے کی پٹائی ہوتی ہے اور اگر امتحان کے پرچے میں ایسی باتیں لکھ کر آئے تو فیل کر دیا جاتا ہے - اگر اس سے کہا جائے کہ وہ کلاس میں، اور امتحان کے پرچے میں وہی کچھ لکھے جس کی اسے اسکول میں تعلیم دی جاتی ہے، تو اس کا سینہ ایک عجیب نفسیاتی کشمکش کی آماجگاہ بن جاتا ہے جس سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی - اس "اسلامیات" کے تعویذ نے محکمہ تعلیم کو آفات و بلیات سے

محفوظ کر دیا ہے یا نہیں، اس کا تو ہمیں علم نہیں۔ لیکن یہ تو یقینی ہے کہ اس سے ان معصوم بچوں کو عجیب قسم کے بھوت پریت چمٹ گئے ہیں جن سے کسی بہت بڑے "عامل" کے بغیر چھٹکارا ناممکن ہے۔

پھر جس طرح بڑے بڑے مقبروں کی جاذبیت، اہمیت اور رونق کا مدار ان کے عرسوں پر ہوتا ہے۔ کتنی قبریں ہیں جو محض عرس کی بدولت مقبرے بن جاتی ہیں۔ (اور آجکل محکمہ اوقاف کی بدولت، اس قسم کی ترقیاں آئے دن ہوتی رہتی ہیں)۔ اسی طرح ہمارے محکموں کی اہمیت کا مدار ان کی رپورٹوں پر ہوتا ہے۔ آپ ان کی رپورٹیں پڑھ کر دیکھئے تو یوں دکھائی دے گا کہ

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است و ہمین است و ہمین است

لیکن اگر آپ ان کی اس کارکردگی کا (جو رپورٹ میں درج ہے) خود مشاہدہ کریں تو کیفیت یہ نظر آئے گی کہ

صرف بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے

اور اگر دو چار سال کے بعد آپ کا گزر اُدھر سے ہو تو آپ دیکھیں گے کہ

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے

لیکن اس کے باوجود، ان کی رپورٹ بدستور شائع ہو رہی ہوگی اور نئے نئے اضافوں کے ساتھ ہو رہی ہو گی۔

اسلامیات سے متعلق بھی اسی قسم کی ایک رپورٹ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے جسے حال ہی میں، ویسٹ پاکستان بیورو آف ایجوکیشن۔ لاہور نے انگریزی میں شائع کیا ہے۔ اگر آپ اس رپورٹ کو کمرے میں بیٹھ کر پڑھیں اور باہر نہ جھانکیں، تو آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ ملک میں اسلام کے متعلق علم و عرفان کی نہریں بہہ رہی ہیں، جن سے ہماری نئی پود کے دل و دماغ کی کھیتیاں سیراب ہو رہی ہیں۔ تجربہ گاہوں میں بڑے بڑے دیدہ ور مفکر، عمیق نگاہوں سے ریسرچ میں محو ہیں۔ درسگاہوں سے ہر سال، جید اسکالرز نکلتے چلے آرہے ہیں۔ لائبریریوں میں، ان اسکالرز کے تحقیقی مقالات اور (Theses) کے انبار کے انبار لگ رہے ہیں جو دنیا کے ہر جویائے علم کو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ —— آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے —— اس رپورٹ کے چند اقتباسات آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں، اسکولوں کی سطح پر اسلامیات کے سلسلہ میں، ۱۹۵۹ء کے ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ کا ایک اقتباس دیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ تعلیم سے مقصد کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

> چونکہ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ پورے کے پورے انسان کے جسم۔ قلب و دماغ اور روح کی نشوونما، کامل اعتدال اور سالمیت کے ساتھ کرے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ تعلیم سے طالب علم کے دل میں ان بنیادی اخلاقی اور روحانی اقدار کے لئے جذبات تحسین و آفرین بیدار ہوں

جو تہذیب و تمدن کا سرچشمہ ہیں اور جو انسان کی جملہ مساعی کا منتہیٰ ہونی چاہئیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم کا طریق ایسا ہو جو مذہب کے ان اثرات سے استفادہ کرے جن سے انسانیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ اور جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں دوسروں سے ہمدردی کے لئے کشادہ اور رواداری۔ ایثار، خویش اور خدمتِ خلق کے جذبات کی بیداری ہوتی ہے اور انسان اور انسان میں مصنوعی امتیازات مٹ جاتے ہیں۔ خدا اور اس کے رسولوں کے لئے احترام، انسان کی روح میں پاکیزگی پیدا کرتا ہے اور اس کے دل کے دروازے، نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کے لئے کھول دیتا ہے۔ (صفحہ ۱۵)

آپ نے غور فرمایا کہ تعلیم کے یہ مقاصد (رپورٹ کے اعتبار سے) کس قدر بلند اور انسانیت ساز ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس تعلیم کی اسکیم ان مقاصد کو سامنے رکھ کر مرتب کی جائے اور عمل میں لائی جائے، اس کے نتائج کس درجہ خوشگوار ہوں گے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں رپورٹ میں مذکور ہے۔

مذہبی تعلیم کے سلسلہ میں، جس وسیع پیمانے پر نصاب و نظام مرتب کیا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس دور کا پاکستان اس مسئلہ کو خاص اہمیت دیتا ہے، پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ مذہبی تعلیم کے لئے نصاب و نظام نہایت احتیاط سے مرتب کیا گیا ہے اور اسے قومی سطح پر عمل میں لایا گیا ہے۔ مغربی پاکستان میں، مذہبی تعلیم کو اب ایک مرکزی مقام حاصل ہے۔ یہ خوش آیند انقلاب، پاکستان کی نشاۃِ ثانیہ کا بڑا جاذبِ نگاہ اور نمایاں عنصر ہے (صفحہ ۲۳)

یعنی پہلے، اسلامیات سے متعلق تعلیم کے مقاصد عالیہ بیان کئے گئے۔ اور اس کے بعد، ان مقاصد کے حصول کے لئے جو طریق کار اختیار کیا گیا، اس کا ذکر مندرجہ بالا الفاظ میں کیا گیا۔ ازاں بعد، اس جد و جہد کے نتائج کا ذکر ہے۔ اور یہ مقام، پہلے مقامات سے کہیں زیادہ اہم ہے، کیونکہ اصل معیارِ کامیابی تو کسی اسکیم کے نتائج ہی ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں رپورٹ میں کہا گیا ہے۔

اسلامی کلچر اور تہذیب کے لئے ریسرچ کرنے کے کام کو مغربی پاکستان میں ایک خاص تحرک حاصل ہوا ہے۔ اس امر کی تصدیق، اس ریسرچ کے نتائج سے ہوتی ہے جو اس میدان میں کی گئی ہے۔ یونیورسٹیوں۔ مذہبی اداروں اور صاحب علم افراد نے جو کچھ اس ضمن میں کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اب نظری اور تجریدی تحقیق سے دلچسپی کم ہو رہی ہے اور اس کی جگہ توجہ کا رُخ اس طرف مُڑ رہا ہے کہ انفرادی۔ قومی اور بین الاقوامی

مسائل کا تجزیہ کیا جائے اور قرآن وسنت کی روشنی میں ان کا موثر حل دریافت کیا جائے۔ (صفحہ ۳۱)۔

کتنی خوش آئند ہے یہ تبدیلی! اس کے بعد تفصیل سے یہ بتایا گیا ہے کہ وہ (۱) انفرادی (۲) قومی اور (۳) بین الاقوامی مسائل کیا ہیں جن کے حل تلاش کرنے کا اہم کام ہمارے ان محققین نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ انفرادی مسائل کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

(۱) انسانی ذات اور کیریکٹر کی نشوونما کا اسلامی طریقہ۔ (۲) عام جذباتی عوارض کی روک تھام اور ان کا علاج ' قرآنی اصول و اعمال کے ذریعے۔ (۳) ذاتی اور پیشہ ورانہ اخلاقیات کا اسلامی ضابطہ۔ (۴) محنت کی عزت و وقار پر قرآن کس قدر زور دیتا ہے۔ (۵) اسلامی احکام کی روشنی میں روزمرہ کی زندگی میں حسن معاملہ۔ (۶) شادی اور گھریلو زندگی کے متعلق اسلامی زاویۂ نگاہ۔ (۷) تعلیم اور بچوں کی تربیت کے متعلق قرآنی تصور۔ ذاتی اور معاشرتی اقدار کے متعلق اسلام کی تعلیم۔ (۸) علم و دانش کے حصول کے لئے قرآن کی تلقین۔

یہ ہیں (انفرادی) زندگی سے متعلق وہ موضوع جن پر تحقیق کی جارہی ہے۔ قومی دائرے کے متعلق چند ایک موضوعات ملاحظہ فرمائیے۔

قومی تشکیل نو کے متعلق قرآن کی راہ نمائی۔ نظام تعلیم کے متعلق اسلام کا تصور۔ اسلامیات کے متعلق نصاب کی کتابوں کی تالیف و تصنیف۔ معاشرتی برائیوں کا استیصال قرآن کی روشنی میں۔ مذہبی راہ نماؤں کی تعلیم و تربیت۔ قرآن وسنت کی روشنی میں ملک کے قوانین کی از سرِ نو تدوین۔ آرٹ۔ لٹریچر۔ کاروبار۔ ملازمت اور دیگر شعبہ جاتِ زندگی میں معیوب رجحانات کے متعلق اسلام کا فتویٰ، وغیرہ۔

اب بین الاقوامی دائرۂ زندگی کو لیجئے۔ اس باب میں موضوعاتِ تحقیق ملاحظہ فرمائیے۔

تفہیم باہمی اور بین الاقوامی امن کے سلسلہ میں اسلام کا زندگی بخش پیغام۔ طبقاتی۔ معاشرتی۔ معاشی۔ قومی اور نسلی۔ غیر معقول امتیازات کی مخالفت میں اسلام کی تعلیم۔ بین الاقوامی تنازعات کے حل کے لئے قرآنی طریق کار۔ نوع انسان کی عالمگیر برادری کے سلسلہ میں اسلام نے جو تعلیم پیش کی ہے اس کی روشنی میں مشرق اور مغرب کے درمیان حائل شدہ خلیج کا پاٹ دینا۔ نوع انسان کی نشوونما وارتقاء کے لئے

اسلام نے کیا کچھ کیا ہے، اس کی تحقیق۔ وغیرہ وغیرہ۔

موضوعات کی فہرست کی ایک جھلک آپ نے دیکھ لی۔ اب ان پر ریسرچ کے معیار کے متعلق سنئے۔ کہا گیا ہے۔

> ان موضوعات پر جو تحقیقات کی گئی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر کا معیار نہایت بلند ہے۔ ...... پنجاب یونیورسٹی کے اسلامک سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ کے اساتذہ اور طلبا نے جو ۱۰۸ تحقیقاتی مقالات پیش کئے ہیں، ان میں جس بلندیٔ فکر اور لطافت ذوق کا مظاہرہ کیا گیا ہے، اسے دیکھ کر انسان محوِ حیرت ہو جاتا ہے...... حقیقت یہ ہے کہ اس امر کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بیرونی ممالک کے جو ریسرچ اسکالرز، اسلامی کلچر اور تہذیب کے متعلق نہایت مستحکم خطوط پر اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہیں، ان کے لئے (ہماری ان تحقیقات نے) اعلیٰ پایہ کی مساعد فضا پیدا کر دی ہے (کہ وہ آئیں اور ہم سے اپنی تشنگیٔ علم و فکر کی سیرابی کا سامان حاصل کریں)۔ (صفحہ ۳۱- ۳۳)۔

آپ غور فرمائیے کہ جس ملک میں اسلامیات کے متعلق اس قسم کی تحقیق ہو رہی ہو، اور اس تحقیق کا پایہ اس قدر بلند اور میدان اس قدر وسیع ہو، اس ملک میں کسی کو اس قسم کی ذرا بھی شکایت ہو سکتی ہے کہ ہماری تعلیم ناقص ہے؟ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ (اس رپورٹ کے مطابق) اگر پاکستان کے ریسرچ اسکالرز اور ان کے تحقیقاتی کارناموں کو ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے، اور دوسرے پلڑے میں ساری دنیا کے ارباب علم و فضیلت اور ان کی علمی اور تحقیقاتی کاوشوں کا ماحصل، تو بھی پاکستان کا پلڑا جھکا رہے گا۔ ہم محکمہ تعلیم اسلامیات کے ارباب حل و عقد کی خدمت میں ان کے اس عدیم النظیر اور فقید المثال کارنامہ پر ہدیۂ ہزار تبریک و تہنیت پیش کرتے ہوئے، صرف ایک گزارش عرضِ خدمت کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ

> کیا وہ، ان تمام محققین کرام میں سے کسی ایک کی نشاندھی کر دیں گے جو یہ بتا سکے کہ اسلام کیا ہے اور انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے نظام کی حیثیت سے اس نے کیا پیش کیا ہے۔ یا وہ کم از کم ان حضرات کی تحقیقات میں سے کوئی ایک تالیف یا تصنیف ایسی پیش کر دیں جس میں یہ کچھ بتایا گیا ہو۔

اس حسرت زدہ ناکام و نا امید اُمت پر آپ کا یہ احسانِ عظیم ہوگا!

"تکلف بر طرف۔ ہم اپنے ارباب بست و کشاد سے، درد بھرے دل سے درخواست کریں گے کہ خدا کے لئے تعلیم کے مسئلہ کو وہ اہمیت دیجئے جس کا یہ مستحق اور متقاضی ہے۔ ہم اس سے بہت کھیل کھیل چکے ہیں۔ اب اسے

(بقیہ لمعات ۷۷ پر دیکھئے)

باسمہ تعالیٰ

معرکۂ دین و وطن

محترم پرویز صاحب کی تقریر

جس سے انہوں نے ۱۱ ستمبر ۱۹۶۴ء کو قائداعظمؒ کی برسی کی تقریب پر وائی - ایم - سی - اے ہال - لاہور میں

جلسۂ عام سے خطاب کیا

شائع کردہ - ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ - لاہور

باسمہ تعالیٰ

معرکۂ دین و وطن

توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

صدر محترم و برادران عزیز! سلام و رحمت۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میرے آج کے خطاب کا موضوع ہے "معرکۂ دین و وطن"۔ آپ میں سے جن حضرات نے تحریک پاکستان کی کشمکش کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا جنہیں اس کی تاریخ سے دلچسپی رہی ہے، انہیں اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ اس موضوع سے مراد کیا ہے اور دین و وطن کا یہ معرکہ کیا تھا۔ لیکن ہماری موجودہ نسل کے نوجوان اس عنوان سے نہیں سمجھ سکیں گے کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ وہ کہیں گے کہ دین، دین ہے اور وطن، وطن۔ ان دونوں میں کسی قسم کا تزاحم و تصادم کس طرح ہو سکتا ہے جو اسے معرکہ سے تعبیر کیا جائے! دین اور وطن کے معرکہ کے معنی ہی کچھ نہیں ہو سکتے۔ ہمارے یہ نوجوان سچے ہیں۔ ہم نے نہ آج تک تحریک پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب کی، اور نہ ہی قائد اعظم (علیہ الرحمۃ) کی قابل اعتماد سوانح عمری شائع کی جس سے اس معرکہ کی تفاصیل سامنے آسکتیں اور اس سے ہماری یہ ابھرنے اور بڑھنے والی نسل سمجھ سکتی کہ وہ کیا جنگ تھی جو ہمارے قائد نے لڑی تھی اور کونسا معرکہ تھا جسے اس نے یکہ و تنہا؛ ایں جرأت و لبسالت سر کیا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک اس جنگ کی علت غائی اور اس معرکہ کے وجوہ و اسباب سامنے نہ آئیں نہ تحریک پاکستان کی غرض و غایت سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا تھا۔ اس جداگانہ مملکت کے وجود میں لانے سے مقصد کیا تھا۔ اگر یہ مملکت متشکل نہ ہوتی تو ہمارا کیا حشر ہوتا۔ اور اس کے متشکل ہو جانے سے ہمیں کیا حاصل ہوا۔ اور یہ واضح ہے کہ جب تک ہماری موجودہ (اور آئندہ) نسل کے سامنے یہ حقائق نہ آئیں، نہ ان کے دل میں اس مملکت کی صحیح قدر و قیمت کا احساس پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ اس کی حفاظت اور استحکام کے لئے کسی قربانی کے لئے لطیب

موضوع کی اہمیت

خاطر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ میں نے اس ہال میں قائد اعظمؒ سے متعلق مختلف تقاریب کے سلسلہ میں جس قدر تقاریر کی ہیں ان سب سے میرا مقصود یہی تھا اور آج کی تقریر سے بھی یہی مطلوب ہے۔

عزیزانِ من!

آپ نے لوگوں کو اکثر کہتے سنا ہو گا کہ فلاں شخص کی زندگی بڑی کامیاب ہے جب انسان کے سامنے کوئی بلند مقصد نہ ہو تو کامیاب زندگی کا معیار سمٹ سمٹا کر یہ رہ جاتا ہے کہ

"بی۔ اے کیا۔ نوکر ہوئے۔ پنشن لی۔ اور مر گئے"

لیکن جن افراد یا اقوام کے سامنے زندگی کے بلند مقاصد ہوں' ان کے ہاں کامیاب زندگی کا معیار کچھ اور ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے ماپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ جب وہ دنیا میں آیا تو اس نے

کامیاب زندگی کا معیار

اپنے ماحول کو کیسا پایا اور جب وہ یہاں سے گیا تو اس نے اس ماحول کو کس حالت میں چھوڑا۔ اگر اس نے اپنے ماحول اور معاشرہ کو اپنے پیش نظر مقصد کے لئے ناساز گار پایا تو اس کا ردِ عمل کیا تھا۔ جس زمانے میں ملوکیت کے استبداد کی وجہ سے ہماری قوتیں مفلوج اور ارادے مصلوب ہو چکے تھے' ہمیں' ہمارے معلمینِ اخلاق یہ سبق پڑھایا کرتے تھے کہ — <u>زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز</u> — اگر زمانے کے حالات تمہارے مقصد کے لئے ساز گار نہیں تو تمہیں چاہیئے کہ اپنے مقصد کو چھوڑ کر زمانے کے ساتھ چلنے لگو۔ لیکن قرآن کی تعلیم اس کے برعکس تھی۔ یہ وہ تعلیم تھی جسے علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نسازد با مزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیبِ نو ذرّات را
می کند از قوتِ خود آشکار — روزگارِ نو کہ باشد ساز گار

یعنی اگر زمانے کے حالات اس صاحبِ عزم و ہمت کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ زمانے کے دھارے کا رُخ بدل دیتا ہے اور اپنی مسلسل سعی و کاوش اور پیہم تگ و تاز سے اسے مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔ اس لئے کہ — ایام کا مَرکب نہیں' راکب ہے قلندر۔ اس حقیقت کو حضرت علامہ نے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

آئیے ہم دیکھیں کہ آج ہم جس لیڈرِ جلیل کی برسی منانے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں، اس معیار کے مطابق اس کی زندگی کامیاب زندگی کہلا سکتی ہے یا نہیں۔

محمد علی جناح کے شعور نے جب آنکھ کھولی تو اس نے دیکھا کہ اس کا ملک، انگریز کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس مردِ غیور و جسور کے لئے یہ احساس ناقابلِ برداشت تھا۔ اگر وہ زمانہ کے ساتھ چلنے کا مسلک اختیار کرتا تو

انگریز کے خلاف جنگ

وہ تمام مناصب و مدارج، جو اس زمانے میں کسی ہندوستانی کو مل سکتے تھے، اس کے قدم چومتے۔ لیکن اس نے یہ روش اختیار نہ کی اور ملک کو انگریزی استعمار کی گرفت سے نجات دلانے کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہوگیا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا دور تھا۔ جب انگریز کے استبداد کی گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی تو اس کے سامنے ایک اور حقیقت بے نقاب ہوئی جس سے اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اور یہ وہ دور ہے جس میں اسے ہندو، انگریز اور خود مسلمانوں کے ایک گروہ کے ساتھ بیک وقت لڑائی لڑنی پڑی۔ یہی ہے وہ دور جس میں اس کی صحیح عظمت ہمارے سامنے آتی ہے اور اس کی زندگی اس معیار پر پوری اترتی ہے جسے ہم نے کامیاب زندگی کا معیار قرار دیا ہے۔

ہندو کے عزائم

جب ملک سے انگریز کی گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی تو ہندو کے سینے میں چھپے ہوئے عزائم رفتہ رفتہ بے نقاب ہونے لگے۔ اس کی اسکیم یہ تھی کہ انگریز کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد، ہندوستان میں بسنے والے تمام افراد کو ایک قوم فرض کر کے یہاں جمہوری انداز کی حکومت قائم کی جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ جمہوری اندازِ حکومت میں سارا اقتدار اور اختیار، اکثریت کے ہاتھوں میں رہتا ہے اور اقلیت کو ان کے رحم و کرم پر زندگی گذارنی پڑتی ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کے الفاظ میں۔

> دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔ (میری کہانی - جلد دوم - صفحہ ۵۵)

لہٰذا ہندو کی اسکیم کی رو سے ہندوستان میں جمہوری حکومت کے معنی یہ تھے کہ یہاں مسلمان مستقلاً اور دائماً ہندوؤں کے محکوم رہیں ـــــ اسے فطرت کی ستم ظریفی کہئے یا مسلمان بادشاہوں کی کوتاہ نگہی کہ جس ملک پر مسلمانوں نے ہزار برس تک حکومت کی ہو وہاں یہ اقلیت میں ہوں۔ ہمارا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان فرمانروا، ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بناتے۔ ایسا کرنا تو قرآن کی رو سے جائز ہی نہیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ اگر ان حکمرانوں میں ذرا بھی اسلامی نظریۂ زندگی کا شعور ہوتا اور وہ یہاں کی دبی اور کچلی ہوئی انسانیت کے ساتھ (جسے ہندو دھرم نے حیوانوں سے بھی بدتر مقام دے رکھا تھا) ذرا سا بھی انسانی سلوک کرتے تو وہ خود بخود حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتی اور آج ہندوستان کی سیاست کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ یہ تو خیر ضمنی بات تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ ہندو کی اسکیم کے مطابق، مسلمان کو ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ

کے لئے ہندو کا غلام بن کر رہنا پڑتا تھا۔ یہ ایکیم اس مفروضہ پر مبنی تھی کہ ہندوستان کے تمام باشندے، محض ایک ملک میں بسنے کی وجہ سے، ایک قوم ہیں۔ قرآن کی رو سے یہ مفروضہ ہی غلط تھا۔ وہ قومیت کی تشکیل، وطن کے اشتراک کی رو سے نہیں کرتا بلکہ آئیڈیالوجی کے اشتراک کی رو سے کرتا ہے۔ اس کے اس اصول کی رو سے صورت یہ تھی کہ مکہ کا رہنے والا ابوجہل، جو نہ صرف اس وطن کا باشندہ تھا جس وطن میں خود رسول اللہ رہتے تھے بلکہ رنگ۔ نسل۔ زبان کے لحاظ سے بھی انہی میں سے تھا، ایک دوسری قوم کا فرد تھا اور روم کا صہیب، حبش کا بلال اور فارس کا سلمان ایمان کے اشتراک کی بنا پر قرآنی اُمت کے افراد۔ وطن۔ رنگ۔ نسل۔ زبان کا اشتراک ابوجہل اور ابوبکرؓ کو ایک قوم کے افراد نہیں بنا سکتا تھا۔ تشکیل امت کا یہ وہ اصول تھا جسے حضرت ابراہیم نے ان چار لفظوں میں سمٹا کر بیان کر دیا کہ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ (۱۴/۳۶) جو میری پیروی کرتا ہے وہ میرا ہے۔ یہ تھا وہ معیار قومیت جسے قرآن نے چودہ سو سال پہلے پیش کیا تھا اور جس کی دعوت

نیشنلزم کی لعنت

علامہ اقبالؒ برسوں سے دیتے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے مسلمان کو بہت پہلے متنبہ کیا تھا کہ

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنائی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دین ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

انہوں نے اس حقیقت کا اعلان کھلے الفاظ میں کیا کہ

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

انہوں نے اس مسلمان سے جو مغربی انداز سیاست سے متاثر ہو رہا تھا کہا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اسی بنا پر انہوں نے کہہ دیا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والا مسلمان، محض اشتراکِ وطن کی بنا پر ہندو کا ہم قوم نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے تمام مسلمان، ایمان کے رشتے کی بنا پر ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم ہیں اور اسی بنا پر وہ ایک الگ مملکت کا تقاضا کرتے ہیں۔ اقبال نے یہ مطالبہ ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا لیکن اُس وقت اس پر کسی نے خاص توجہ نہ دی۔ اور (ہندو تو ایک طرف خود) مسلمانوں نے بھی اسے یہ کہہ کر درخورِ اعتنا نہ سمجھا کہ یہ محض ایک شاعر کا خواب ہے جسے حقیقت سے کچھ واسطہ نہیں۔ لیکن اب جو قائداعظم نے اُسی حقیقت کو پیش کیا تو ہندو کے قصرِ سیاست میں زلزلہ آگیا۔ اس لئے کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد اس کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا جس کی

مسلم قومیت کے خلاف ہندو کا محاذ

رو سے وہ اپنی ہزاروں سال کی غلامی کا انتقام، مسلمانوں سے لینا چاہتا تھا۔ یہ تھا وہ پہلا محاذ جس پر قائداعظمؒ کو آزادی کی جنگ لڑنی پڑی۔ انہوں نے یہ آواز بلند کی تو چاروں طرف سے اس کے خلاف کائیں کائیں ہونے لگ گئی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے، مارچ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبہ صدارت میں کہا کہ

> ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو، مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔

پھر انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا۔

> مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پروازِ خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔

دوسری طرف سے مہاتما گاندھی نے پکارا کہ

> میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباء و اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعوے کریں کہ وہ اپنے آباء و اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان، اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا، تو اسلام کے بعد اسے ایک ہی قوم رہنا چاہئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔
>
> (گاندھی کا خط جناح کے نام مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء)

ہندوؤں نے تو یہ کچھ کہنا ہی تھا کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس سے ان کے تمام منصوبے خاک میں مل رہے تھے۔

نیشنلسٹ مسلمان

لیکن حیرت اس پر تھی کہ خود مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد بھی اس باب میں ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ انہیں اُس زمانے میں نیشنلسٹ مسلمان کہا جاتا تھا جن میں جمعیت العلماء ہند۔ سرحد کے سرخ پوش۔ مجلس احرار۔ بہار کے انصار وغیرہ سب شامل تھے اور قائداعظمؒ کے اس مطالبہ کے خلاف، ہندوؤں کی فوج کے ہراول دستے کے طور پر میدانِ جنگ میں اتر آئے تھے۔ چنانچہ صوبہ بہار کے اُس زمانے کے وزیر ڈاکٹر سید محمود نے (جواب ہندوؤں کے مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ہندوستان میں شادی مجالس قائم کر رہے ہیں) یہاں تک کہہ دیا کہ

> لفظ ہندی کو ہندی زبان کے لئے نہیں بلکہ اہل ہند کے لئے اختیار کرنا چاہئے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایسا ہے جس میں مختلف لوگ مذاہب کی رو سے شناخت میں آتے ہیں۔ اس سے ہماری دماغی کیفیت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے اور ہمارے متعلق یہ بات ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس براعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں۔ اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کریں۔

یعنی ان کی تجویز یہ تھی کہ مسلمان (الگ قوم بننا تو ایک طرف) اپنے آپ کو الگ نام (مسلمان) سے بھی نہ پکاریں بلکہ اپنے آپ کو صرف ہندی کہیں ـــــ "ناکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری"۔ اُدھر سے جناب جوش ملیح آبادی صاحب (جو اس زمانے میں اپنا ماہنامہ کلیم نکالتے تھے۔ اور اب پاکستان میں تشریف فرما ہیں) للکارتے ہوئے بولے۔

> اپنے آپ کو مسلم یا ہندو پہلے اور ہندوستانی بعد میں کہنا جغرافی صداقت اور فطری قانون کے خلاف ہے۔ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے۔ لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی جلد ہے۔ بدن کی جلد کیسی؟ قومیت تو ہمارا گوشت، پوست اور ہمارا ضمیر ہے۔ لباس ہر وقت بدلا جا سکتا ہے لیکن پوست اور ضمیر کو کون بدل سکتا ہے؟ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ قومیت اور وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جس کا تبدیل کر دینا طاقتِ بشری سے باہر ہے۔[1]
>
> (کلیم۔ دسمبر ۱۹۳۸ء)

حتیٰ کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تک نے یہ کہہ دیا کہ "قومیتیں اوطان سے

---

[1] معلوم نہیں وہ کونسی طاقت تھی جس سے یہ حضرات اب اپنی سابقہ قومیت بدل کر، پاکستانی قومیت اختیار کر گئے ہیں۔ (طلوع اسلام)

مولانا مدنی مرحوم

ملتی ہیں"۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ اقبالؒ مرض الموت میں مبتلا، صاحب فراش تھے۔ ایک اتنے بڑے مذہبی عالم کی زبان سے، یہ اعلان ان کے قلب حساس پر نشتر بن کر گرا اور ایک آہ بن کر ان الفاظ کی شکل میں ان کے لبوں تک آ گیا کہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است
بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

اس کے بعد جب مولانا مدنی (مرحوم) نے اپنا جواب شائع کیا، تو حضرت علامہؒ نے فرمایا -

اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہوگا۔ اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی -

غرضیکہ میدان سیاست میں چاروں طرف سے اس طرح کے حملے ہو رہے تھے، اور قائداعظم (علامہ اقبال کی وفات کے بعد) یکہ و تنہا ان تمام حملوں کا جواب دے رہا تھا اور مسلمانوں سے کہہ رہا تھا کہ نیشنلزم کا یہ تصور ہندوستان میں انگریز کا جاری کردہ ہے۔ جسے ہندو نے اپنی خاص مصلحت کے ماتحت اپنا لیا ہے یہ نظریۂ اسلام کے خلاف ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کو تباہ و برباد کر دینے کا موجب۔ لیکن اس کے باوجود، یہ مخالفت مسلسل اور بدستور جاری تھی۔ اس مقام پر ضمناً یہ دیکھئے کہ وہی لوگ جو اسوقت قائداعظمؒ کی اس قدر مخالفت کرتے تھے آج کس طرح، زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر، اور ہندوؤں کے ہاتھوں تنگ آ کر اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو رہے ہیں کہ اقبال اور جناح سچ کہتے تھے۔ (مثلاً) بجنور کے جریدہ، مدینہ کی ۲۸ اگست ۱۹۶۴ء کی

اعتراف حقیقت

اشاعت میں، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب (جو مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے خاص گردوں اور ارادت مندوں میں سے ہیں) کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں

"میں آپ کو آج کا نیشنلزم بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ وہ ہے کیا؟ اس عقیدہ کا بانی میکیاولی ہے جو اٹلی میں ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوا۔ اس عقیدے کی رو سے اسٹیٹ خیر اکبر یا خیر کل ہے۔ اس کے مقابلہ میں انسان اس کا محکوم اور بندہ ہے اگر کسی انسان کے مذہبی فرائض وطن اور اس کے تقاضوں سے آ کر ٹکراتے ہیں تو قابل رد ہیں اور مذہبی فرائض کی آواز بلند کرنے والا انسان وطن دشمن اور باغی ہے۔

"اس عقیدے کی اشاعت انگریز نے تحریک خلافت کے زمانہ سے شروع کی اور اسلامی ملکوں کا اسلامی رشتہ

سے جُدا کر کے وطنیت کے نام پر تقسیم کر دیا۔ کیونکہ انگریز مسلمانوں کی منظم طاقت سے گھبراتا تھا۔ یہی حربہ انگریز نے ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا۔ اور تحریک خلافت جو ہندوستان میں مسلمانوں کی خالص اور اعلیٰ سیاسی قیادت تھی اُس کو نیست و نابود کر دیا افسوس کہ ہم انگریز کی چال کو نہ سمجھ سکے۔ جس کی بدولت انگریز کو اور کچھ عرصہ کے لئے ہندوستان میں ٹھکانا مل گیا۔ انگریز خوش تھا کہ اُس نے اپنے سب سے بڑے حریف کو شکست دے دی۔

" آج اسی عقیدے کا طفیل ہے کہ مسلمان ملکوں کے نام پر تقسیم ہو چکے ہیں آج صدر ناصر محض اسی عقیدے کے سہارے عرب قومیت کو متحد کر رہا ہے۔ اس کو اس سے سروکار نہیں ہے کہ اسلامی رشتہ، عرب قومیت سے زیادہ قوی ہے یا نہیں اس کو اس سے بھی کوئی غرض نہیں ہے کہ مسلمانان عالم کس حال میں ہیں ہاں دنیا میں جو انسان بھی عربیت سے متصف ہے یعنی جغرافیائی اعتبار سے عرب ہے صدر ناصر اس کے لئے سب کچھ کرنے کیلئے تیار ہیں لیکن جو مسلمان عرب جغرافیائی حدود سے باہر ہے اُس کی لاش پر وہ آنسو بہانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

" اب رہا ہندوستانی مسلمانوں کا معاملہ ان بچاروں کا کیا پوچھتے ہو یہ جہاں ایک طرف مظلوم ہیں وہاں، اندھے مقلد بھی ہیں۔"

اگر یہ نیشنلسٹ حضرات، اُس وقت اس حقیقت کو سمجھ لیتے اور قائداعظمؒ کی مخالفت نہ کرتے تو آج پاکستان کا نقشہ بھی کچھ اور ہوتا اور ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی حالت بھی کچھ اور۔ بلکہ ہمارا خیال ہے کہ اس صورت میں ہندوستان میں کوئی مسلمان پیچھے رہتا ہی نہیں۔ تمام مسلمان ایک آزاد مملکت کے باشندے ہوتے جس کی حدود ان کی آبادی کے لحاظ سے متعین ہوتیں۔ یعنی ملک کی تقسیم، تمام مسلمانوں کی تعداد کے تناسب سے ہوتی اور یہ سب اس جدید مملکت کے باشندے ہوتے۔ خیر یہ تو ضمنی بات تھی میں کہہ یہ رہا تھا کہ قائداعظمؒ کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہو رہا تھا اور چاروں طرف سے اس کی اسقدر شدید مخالفت ہو رہی تھی۔ یہ وہ جنگ تھی جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ——— بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن۔ اس معرکہ میں وہ مرد مجاہد اپنے آہنی عزم کے ساتھ چٹان کی طرح کھڑا تھا اور مردِ دیدۂ بینا سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ ———

ست ہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا۔

اب برادرانِ عزیز! آگے بڑھئے اور اس معرکۂ دین و وطن کا دوسرا محاذ دیکھئے۔

ہندو مسلمانوں سے یہ کہتا تھا کہ جب انگریز یہاں سے چلا جائے گا تو ملک آزاد ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد ہم تمہیں مذہبی آزادی دے دیں گے۔ تم اطمینان اور سکون سے نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ ادا کرتے رہنا ——— اب اور چاہتے کیا ہو؟ ہمیں تو یہی مل جائے! اس کے جواب میں ان سے کہا جاتا کہ مذہب کے متعلق یہ تصور، ہندو دھرم

مذہب اور دین میں فرق

کے سلسلہ میں تو درست ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ مذہب نہیں، دین ہے۔ اور دین کے معنی ہیں طریقِ زندگی۔ نہجِ حیات۔ آئینِ مملکت۔ دستورِ حکومت مسلمان دین کے نقطۂ نگاہ سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا جب تک اس کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو جس میں یہ دین کو ایک عملی نظام کی حیثیت سے رائج اور متمکن کر سکے۔ جب اسلام کا یہ تصور پیش کیا گیا تو یوں سمجھو گویا کسی نے بھڑوں کے چھتے میں پتھر دے مارا ہو۔ چاروں طرف سے مخالفت کی ایسی یلغار ہوئی کہ توبہ بھلی۔ یوں نظر آتا تھا گویا یہ لوگ جناح کو نوچ ہی ڈالیں گے۔ ایک طرف سے پنڈت جواہر لعل نہرو للکار رہے تھے جس چیز کو دین یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔ یہ اندھے یقین۔ ترقی دشمنی۔ بے دلیل عقیدت اور تعصب اور توہم پرستی کا دوسرا نام ہے۔" (میری کہانی) دوسری طرف سے گاندھی جی کی آواز آئی کہ

> اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم میں اس (علیحدگی) کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے حکومت کو اس سے کیا واسطہ؟ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے۔ مثلاً صحت۔ رسل و رسائل۔ امور خارجہ وغیرہ۔ مذہب سے اسے کچھ واسطہ نہیں ـــــ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔
>
> (ہریجن مورخہ ۹ ۲۲/۴۶)

ادھر ایوانِ اسمبلی سے مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے (جو اس زمانہ میں مرکزی اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے لیڈر تھے) چلا کر کہا۔

> اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اس کا اعتراف کریں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کریں کہ ضمیر۔ مذہب۔ اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمانوں کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاسیات سے الگ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے عصرِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز ۵ ۹/۴۶)

بھولا بھائی ڈیسائی نے یہ کہا اور اُدھر سے جناب جوش ملیح آبادی نے مصرعہ اٹھایا اور کہا کہ بجا فرمایا آپ نے۔ مذہب ہے ہی ایسی چیز ـــ عزیزانِ من! میں انکے الفاظ کو سینہ پر پتھر رکھ کر دہرا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا۔

> عظیم الشان پیغمبروں کی (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) حسرتناک تاریخیں اور ان کی پاک زندگی کے حوصلہ شکن حالات ہمارے سامنے ہیں اور ہم سے صداقت الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ انسان کی دکھتی ہوئی رگ کا چھیڑنا کس قدر بے نتیجہ اور خطرناک ہوا کرتا ہے۔ مذہب کا بیان یہ ہے کہ خدا نے انبیاءؑ کے ذریعے نوعِ انسان کی اصلاح کرنی چاہی تھی۔۔ اور اس سلسلہ میں ہزاروں نہیں لاکھوں انبیاء مبعوث فرمائے گئے۔ مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ اس کا جواب مجھ سے نہ طلب فرمایئے۔ عام انسانی حالات و میلانات کو دیکھ کر ذرا اندازہ کر لیجئے کہ انسانیت کا سوادِ اعظم کس راستے پر گامزن ہے۔ (کلیم۔ نومبر ۱۹۳۷ء)

اس سے آپ، برادران! اندازہ لگا لیجئے کہ جس وقت قائداعظم نے یہ آواز اٹھائی تھی کہ مسلمان اپنے لئے ایک آزاد مملکت چاہتے ہیں تاکہ اس میں اپنے دین کو ایک عملی نظام کی حیثیت سے اختیار کر سکیں، اس وقت ملک کا ماحول کس قسم کا تھا۔ آج لوگوں کو عام طور پر اتنا ہی معلوم ہے (اس لئے کہ انہیں بتایا ہی یہ جاتا ہے) کہ یہ مہاتما گاندھی اور قائداعظم کے مابین لیڈری کی جنگ تھی۔ یا زیادہ سے زیادہ بساطِ سیاست کی مہرہ بازی۔ کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ یہ جنگ درحقیقت کفر اور اسلام کی جنگ تھی۔ حق و باطل کی جنگ تھی۔ شرک اور توحید کی جنگ تھی جس میں ایک مغربی وضع کا سِن رسیدہ، نحیف و نزار مسلمان ایک طرف تھا اور ہندو کی پوری قوم کے علاوہ بزعمِ خویش اسلام کے مدعی ـــ جمعیت العلماء ـ احرار ـ جماعت اسلامی ـ اور جوش جیسے نیشنلسٹ سب متحدہ محاذ بنائے اس کے مقابل کھڑے تھے۔ اور وہ ان سب سے اپنے یقینِ محکم کی پوری قوت کے ساتھ کہتا تھا کہ

> جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔
> تم دیکھنا کہ حق بالآخر کس طرح غالب آکر رہتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے ارمغانِ حجاز میں لکھا ہے

نگہ دارد برہمن کارِ خود را ۔۔۔ نمی گوید بکس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر ۔۔۔ بدوشِ خود برد زنارِ خود را

اس میں درحقیقت اسی زمانے کی ہندوانہ سیاست کی صحیح صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ ہندو کی ایک طرف تو یہ کیفیت تھی

کہ وہ مسلمان کی زبان سے یہ لفظ بھی نہیں سننا چاہتا تھا کہ مذہب کو سیاست میں کوئی دخل ہے۔ اور دوسری طرف یہ لوگ، انگریز کے چلے جانے کے بعد ہندوستان میں جس معاشرہ کی تشکیل کرنا چاہتے تھے اس کی بنیاد خالص ہندو فلسفہ پر رکھتے تھے۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۹ء میں، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سیکرٹری اچاریہ کرپلانی نے ایک طویل بیان میں بتایا کہ جو لوگ کانگریسی سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں، انہیں معلوم ہو جانا چاہئے کہ یہ مسئلہ صرف

گاندھی فلسفۂ حیات

سیاست کا نہیں بلکہ ہندو فلسفۂ حیات اور نظریۂ زندگی کا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے گاندھی جی کی قیادت قبول کی ہے اور

> گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا ہے کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہل ملک کے ہاتھ میں دیدیں۔ بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظ دیگر ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے تحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے ہندوستان میں لانے کی سعی کر رہے ہیں۔

اب ذرا یہ بھی سن لیجئے کہ جن گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کو ملک گیر نظام کی حیثیت سے رائج کرنے کا تہیہ کیا جا رہا

ہندو گاندھی

تھا وہ گاندھی جی کس فلسفۂ حیات کے داعی تھے۔ اس حقیقت کو خود گاندھی جی کے الفاظ ہی میں سنئے۔ انہوں نے اپنے متعلق فرمایا تھا کہ

> میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اپنشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں۔ اور تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں میں گئو رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں۔ اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے۔ (ینگ انڈیا - ۱۲ ۱/۲)

یہ تھے وہ گاندھی جی جن کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کا ارشاد تھا کہ

> گاندھی جی نے جنگ آزادی میں اپنی حیات اور مال دونوں لٹا دئے۔ پس وہ فی الحقیقت

مجاہد فی سبیل اللہ ہیں۔ (مضامین آزاد - ص ۱۹)

اور انہوں نے پرتاپ گڑھ کانگریس کے موقعہ پر اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا کہ

> وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک ہی روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی روحِ عظیم کو تھکنے نہیں دیتا۔

ایک دفعہ شملہ کے ایک جلسہ میں مسٹر سیتا مورتی کی تقریر تھی جس کی صدارت مسٹر آصف علی مرحوم کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا۔

> ٹیچر کا درجہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ تم کرائسٹ - بدھ - محمدؐ کو بھی ٹیچر کہتے ہو - مہاتما گاندھی بھی اسی قسم کے ٹیچر ہیں -

آپ نے غور فرمایا کہ اُس وقت مسلمان کی ذہنیت کیا بنتی جا رہی تھی؟ اور یہ عقیدہ اُس گاندھی کے متعلق پھیلایا

مہاتما گاندھی کا کردار

جا رہا تھا جس کا کیریکٹر یہ تھا کہ ایک دفعہ انہوں نے ملک میں شراب بند کر دینے کی تجویز کی۔ لوگوں نے کہا کہ اسی طرح آپ جوا اور گھوڑ دوڑ بھی بند کرا دیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ

> اگر میں جوئے کے خلاف مہم شروع کر دوں تو خطرہ ہے کہ میں ان لوگوں کو ہاتھ سے کھو دونگا جو میری مستقل طور پر روپے سے مدد کرتے ہیں۔ اگر گھوڑ دوڑ بند کرا دوں تو وائسرائے سے لے کر معمولی آدمی تک میرے خلاف ہو جائینگے۔ اس طرح میری مہاتمائی ختم ہو جائے گی۔ اور کیا عجب کہ میں اپنے سر کو بھی کھو دوں -
>
> (ہریجن — اکتوبر ۱۹۳۹ء)

اور سنئیے۔ جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی ہے تو مہاتما گاندھی اس زمانے کے وائسرائے (لارڈ لنلتھگو) سے ملے اور اس کا تصور کر کے کہ اس سے لندن کی اہم عمارات کس طرح بمباری سے تباہ ہو جائیں گی، وہ رو پڑے۔ آنسو جاری ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ " اگر انگلستان اور فرانس کو شکست ہو گئی تو ہندوستان کو آزادی حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہوگا "۔ اس کے بعد انہوں نے ایک بیان جاری کیا جس میں جنگ کے حق میں پر زور الفاظ میں تائید کی۔ اس بات کو بمشکل ایک مہینہ گذرا ہوگا کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان جنگ کے معاملہ میں انگریزوں کی مدد نہیں کرے گا جب تک اس کا مطالبہ آزادی تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ۔ اس فیصلہ کی تعمیل میں کانگریس کے مرکزی اسمبلی کے ممبروں نے اسمبلی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اب لوگوں کی (اور بالخصوص لارڈ لنلتھگو کی) نگاہیں گاندھی جی کی طرف لگ رہی تھیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ اور دنیا حیران رہ گئی جب انہوں نے

گاندھی جی کا یہ بیان پڑھا کہ میں مجبور ہوں۔ میں تو ایک کی اقلیت ہوں۔ کانگریس ٹھیک کہتی ہے۔ اور اس کے بعد لارڈ لنلتھگو کو مشورہ دیا کہ آپ ہمارا تعاون چاہتے ہیں تو کانگریس کی شرائط منظور کر لیجئے۔ یہ تھے وہ گاندھی جی جنہیں نیشنلسٹ مسلمان (معاذ اللہ) حضرت مسیحؑ اور جناب نبی اکرمؐ کے پایہ کا ٹھہر مانتے تھے اور انہیں مجاہد فی سبیل اللہ کہہ کر پکارتے تھے۔

یہ تھی اُس وقت مسلمانوں کی ذہنیت جس کے خلاف قائد اعظمؒ کو یہ چو مکھی لڑائی لڑنی پڑ رہی تھی۔

تمام مذاہب یکساں ہیں

ہندو نے اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ مسلمانوں کی اپنے دین کے ساتھ والہانہ وابستگی اس لئے ہے کہ وہ اسے تمام مذاہب عالم سے افضل و اعلیٰ سمجھتے ہیں بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اب دین خالص صرف اسلام ہے۔ اس کے علاوہ باقی مذاہب اس سچائی پر نہیں رہے جو انہیں خدا کی طرف سے ملی تھی۔ اس نے (ہندو نے) سوچا کہ ہندوستان سے اسلام کو (معاذ اللہ) ختم کرنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ ان کی نئی نسل کے دل سے اس خیال کو نکال دیا جائے اور اس کی بجائے انہیں یہ سکھایا جائے کہ تمام مذاہب یکساں طور پر سچے ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اس سلسلہ میں مہاتما گاندھی کے اُس زمانے کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر مہادیو ڈیسائی نے کہا کہ

> ایک جداگانہ قومیت کا تخیل اس خیال سے پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا مذہب دوسرے مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے۔ (ہری جن۔ بابت ۲۵ ۱/۴۵)

اور خود مہاتما گاندھی نے کہا کہ

> میری روح اس بات کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندو مت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے حامل ہیں کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مرادف ہے کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا ہے۔ (ہندوستان ٹائمز۔ مورخہ ۱۴ ۴/۴۶)

وہ اسے انتہائی تنگ نظری پر محمول کرتے تھے کہ یہ کہا جائے کہ مسلمان ایک جداگانہ اور برتر نظریۂ زندگی پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

> میں ایک تنگ نظر ہندو یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور ایک بہت بڑی قوم ہے جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے اور یہ تہذیبیں ایک دوسری میں جذب ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ لیکن مسلم لیگ

نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں
جذب نہیں ہو سکتیں۔ (ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۵ ستمبر)

آپ نے خیال فرمایا کہ اس خیال سے ہندو کے دل پر کیا گذرتی تھی کہ مسلمانوں کا دین' ہندو مت سے الگ اور افضل ہے اور مسلمان ایک جداگانہ تہذیب و تمدن کے علمبردار ہیں۔ مسلمان بچوں کے دل سے اس خیال کو نکالنے کے لئے مہاتما گاندھی نے ایک تعلیمی اسکیم کا منصوبہ بنایا (جسے وار دھا کی تعلیمی اسکیم کہا جاتا تھا)۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کہا۔

> یہ سخت خطرناک بات ہے کہ بچوں کو یہ پڑھایا جائے کہ ان کا مذہب باقیوں سے افضل ہے۔ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس لئے سب مذاہب برابر ہیں۔

مولانا آزاد کی طرف سے سند

لیکن ظاہر ہے کہ مسلمان' اسلام کے متعلق گاندھی جی کی رائے کو سند ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے اس کے لئے کسی عالم دین کی سند درکار تھی۔ یہ سند مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر (ترجمان القرآن) سے بآسانی مل گئی جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

> عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ قرآن نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔

مولانا آزاد کی تفسیر کے اس حصے کا ہندی میں ترجمہ کیا گیا اور کانگریس کی طرف سے اس کی عام اشاعت کی گئی۔ اس تعلیمی اسکیم کا منصوبہ تو گاندھی جی کی اُپج کا نتیجہ تھا لیکن اسے مرتب کیا ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے (جو اب بھارت کے نائب صدر ہیں) یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

چنیں دورِ آسماں کم دیدہ باشد کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دَیرے بنا کردند آنجا پرستد مومن و کافر تراشد

یہ تعلیمی اسکیم اگر بروئے کار آجاتی تو اس کے نتائج جس قدر خطرناک ہو سکتے تھے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ للہ الحمد کہ ہندو کا یہ منصوبہ بھی پروان نہ چڑھ سکا اور انہیں اس تعلیمی اسکیم کے مطابق تیار کردہ کتابوں کو بمبئی کے ساحل سے سمندر کی نذر کرنی پڑیں۔

یہ تو تھے وہاں کے کانگریسی لیڈروں کے عزائم اور ارادے۔ دوسرے لیڈر اپنے تشدد میں ان سے بھی بڑھ کر تھے۔

مسٹر ساورکر

یا یوں کہئے کہ کانگریسی لیڈر جو کچھ اپنے سینوں میں چھپائے رکھتے تھے' دوسرے لیڈر انہیں برملا اگل دیتے تھے۔ مثلاً ہندو مہاسبھا کے پریذیڈنٹ' مسٹر ساورکر کہتے تھے کہ

لفظ ہندو سے عبارت ہے ہر وہ شے جو ہندوستان کی ہو۔ مثلاً کلچر۔
نسل۔ اور روایات۔ اور ہندو کے معنی ہیں ہر وہ شخص جو ہندوستان کا رہنے
والا ہو اور جس کے آباء و اجداد یہاں کے باشندے ہوں۔

(ہندوستان ٹائمز ۲۹ مئی ۲۰)

یعنی انہوں نے (بزعم خویش) فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمان' ہندو ہی ہیں۔ ہندو مہاسبھا کے نائب صدر ڈاکٹر رادھا بکرجی نے آل انڈیا ہندو ویدک یوتھ کانفرنس (لاہور) کی صدارت کرتے ہوئے کہا۔

ہندوستان کو نظری اور عملی طور پر ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہئے جس کا کلچر ہندو
اور جس کا مذہب ہندو ازم ہو۔ اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو۔

اس اسٹیٹ میں مسلم اقلیت کی کیا حالت ہوگی' اس کے متعلق آپ پنڈت جواہر لعل نہرو کا وہ بیان پہلے سن چکے ہیں جس میں انہوں نے کہا تھا کہ

جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت' اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے
قابو میں رکھتی ہے۔

اور آزاد جواہر لعل کے متعلق مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کا ارشاد تھا کہ

جواہر لعل ہندو ہے۔ اس نے کبھی نہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے باوجود
وہ مسلمانوں کی حفاظت چاہتا ہے۔

یہ تھا' برادران عزیز! وہ ماحول جس میں قائداعظم محمد علی جناح گھرا ہوا اکیلا کھڑا تھا ـــــ اس طرح اکیلا جس طرح سمندر کی تلاطم انگیز موجوں میں روشنی کا مینار کھڑا ہو۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں (ربا دنے تصرف)

ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے تھے انداز خسروانہ

نظریہ پاکستان کی مخالفت

ان حالات میں اس مرد آہن گداز نے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا اور اس پر انتہائی ثبات و استحکام سے کھڑا رہا۔ پاکستان کا مطالبہ اسلام کے نام پر کیا گیا تھا کہ اس سے مقصود ہی ایک ایسی آزاد مملکت کا حصول تھا جس میں اسلام کو ایک زندہ نظام حیات کی حیثیت سے متمکن کیا جا سکے۔ پاکستان کے مطالبہ کا ریزولیشن مارچ ۱۹۴۰ء میں پاس ہوا۔ اور شروع اپریل ۱۹۴۰ء میں مہاتما گاندھی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح

اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے مجھے یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آجکل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کرونگا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ باقی سے متنبہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے

(ہندوستان ٹائمز بحوالہ ۷)

مودودی صاحب کی تائید

یہ تھا گاندھی جی کا فتویٰ دکہ قائداعظم" اور ان کے رفقاء اسلام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں)۔ اس کی ہم نوائی میں دوسری طرف سے ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے آواز دی کہ بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔ یہ لوگ واقعی اسلام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ

لیگ کے قائداعظم" سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو

(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ صـ۳۳)

پاکستان کے مطالبہ کا مقصود یہ تھا کہ اس مملکت میں حکومتِ خداوندی قائم کی جائے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۴ نومبر ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں لکھا کہ

حکومتِ خداوندی کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور یہ مسلمانوں کا ایک فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت بڑی خوش آئند ہے کہ مسلمانوں کے ذمہ دار راہ نما اس سراب کے پیچھے نہیں لگنا چاہتے۔

ہندوستان ٹائمز نے یہ کہا اور ادھر سے مودودی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی ان کا گمان غلط ہے۔ اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی

(ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۰ھ۔ صـ۲۹)

آپ نے غور فرمایا کہ وہی حضرات جواب پاکستان میں حکومت خداوندی قائم کرنے کے دعویدار ہیں اُس وقت کس طرح ہندوؤں کی ہم نوائی میں اس تصور کی مخالفت کر رہے تھے۔ انہی کے ساتھ وہ مسلمان بھی شامل تھے جو اپنے آپ کو نیشنلسٹ کہتے تھے۔ مثلاً سندھ کے خان بہادر اللہ بخش نے پاکستان کی تجویز کے متعلق کہا

مسلمانوں کی طرف سے مخالفت

یہ اسکیم آزادیٔ ہند کے راستے میں روڑے اٹکاتی ہے۔

عبدالرحمٰن سرحدی صاحب نے فرمایا

یہ ہندوستان میں برطانوی تسلط قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔

مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہاروی (مرحوم) نے کہا کہ

یہ برطانوی حکومت قائم رکھے گی۔

احراری لیڈر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (مرحوم) نے فرمایا

یہ اسکیم ملک کے مفاد کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے بالخصوص نقصان رساں ہے۔ اگر کبھی اسلامستان وجود میں آیا تو احرار کے ہاتھوں آئے گا۔

بظاہر "اپنوں" کی طرف سے

یہ لوگ تو پھر بھی تحریک پاکستان کے کھلے ہوئے مخالف تھے۔ قیامت تو یہ تھی کہ خود موافقین میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو اس مطالبہ کی مخالفت میں ان لوگوں سے پیچھے نہ تھے۔ تحریکوں کو جسقدر نقصان منافقین کے ہاتھوں سے پہنچا ہے کھلے ہوئے مخالف اتنا نقصان کبھی نہیں پہنچا سکے۔ اُس زمانے میں پنجاب میں سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم تھے اور بنگال میں مولوی فضل الحق صاحب۔ سر سکندر کی یہ کیفیت تھی کہ عین اس زمانے میں جب پاکستان کا ریزولیشن پاس ہوا ہے وہ اسلامیہ کالج کے طلباء کو یہ تاکید کر رہے تھے کہ

زندگی میں تمہارا نصب العین کچھ ہی ہو لیکن یاد رکھو تم کسی ایسی اسکیم کی تائید نہ کرنا جس کا منشاء ہندوستان کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے لئے الگ خطہ منتخب کرنا ہو۔ یہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہوگا۔

ان کے دست راست سر چھوٹو رام نے کہا کہ "سر سکندر کسی خالص اسلامی حکومت میں وزیر اعظم تو ایک طرف کوئی ذمہ داری کا عہدہ لینے کے لئے تیار نہیں ہونگے۔ پنجاب میں صرف پنجابیوں کی حکومت ہوگی"۔ دوسری طرف سے مولوی فضل الحق صاحب بولے کہ

> ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے جناح کی مدد کیوں نہیں کی۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم نے کبھی ایسے شخص کو لیڈر نہیں مانا جو غیر بنگالی ہو۔

جناح، اپنوں اور بیگانوں کی ان بھانت بھانت کی بولیوں کو سنتا تھا اور دل کے پورے سکون اور اطمینان سے، اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ کہتا تھا کہ

> رہے ہیں اور بھی فرعون میری گھات میں اکثر
> مجھے کیا غم کہ میری آستیں میں ہے ید بیضا

چنانچہ ان تمام اعتراضات اور ہفوات کے جواب میں، انہوں نے یکم مارچ سنہ ۱۹۴۱ء کو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے لاہور کے سیشن میں اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا۔

> لاہور کے پلیٹ فارم ہی سے مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا اور آج میں اسی پلیٹ فارم سے اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان ایک ایسی منزل ہے جس تک پہنچنے سے مسلمانوں کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کے برِاعظم میں پاکستان کے علاوہ اور کوئی دستور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پاکستان بن کر رہے گا ..... میں تو یہ کہونگا کہ یہ بن چکا ہے۔

اللہ اکبر! کس قدر یقینِ محکم تھا اس آہنی عزم والے انسان کو اپنے مطالبہ کی صداقت پر۔ اسی یقینِ محکم اور

اعترافِ حقیقت

عزمِ راسخ کا نتیجہ تھا کہ آہستہ آہستہ شدید ترین مخالفین نے بھی اس مطالبہ کی تائید کرنی شروع کر دی۔ (مثلاً، مسٹر این۔ سی۔ دت (جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن تھے) انہوں نے فروری سنہ ۱۹۴۱ء میں اپنی ایک کھلی چٹھی میں (جو اخبار مدینہ بجنور کی یکم فروری کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی) لکھوا۔

> اُن حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے، اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک، متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے اس خیال کا اظہار کیا ہے وہ میرے خیال میں اب نہیں تو توکل حقیقت ہو کر رہے گا بہر حال اگر یہ چیز بھی جلد طے ہو جائے تو کچھ بُرا نہیں۔ یوگوسلاویہ کے کروٹ اور سراب کی طرح اگر ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں

میں بھی بحیثیت فرقہ کے نہیں، بلکہ بحیثیت دو قوموں کے سمجھوتہ ہو جائے اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہندو اکثریت کے علاقے مداخلت نہ کریں۔ اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان مداخلت نہ کریں۔ تب بھی ہندوستان کا اجتماعی مفاد محفوظ رہ سکتا ہے میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہ چاہیئے۔ البتہ اس میں مناسب ترمیم و اصلاح کرکے اُسے اپنے حسب حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(مدینہ، یکم فروری سنہ ۱۹۴۰ء)

حتیٰ کہ لالہ لاجپت رائے جیسے کٹر ہندو اور نظریہ پاکستان کے سخت ترین مخالف نے مسٹر سی۔ آر۔ داس کو ایک خط میں (جو اخبار مرہٹہ کی ۲۰ فروری سنہ ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں چھپا تھا) لکھا۔

"ایک اور چیز جو کچھ عرصہ سے میرے لئے بیحد وجۂ اضطراب ہو رہی ہے وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر دعوتِ غور و خوض دوں۔ گذشتہ ۶ ماہ میں میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور اس سے جس نتیجہ پر میں پہونچا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ چیز (یعنی ہندو مسلم اتحاد) ایک امر محال اور ناقابلِ عمل شئے ہے۔ وہ مسلمان راہنما جو عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہیں اگر اُن کے خلوص نیت کو تسلیم بھی کر لیا جائے پھر بھی میرے خیال میں ان کا مذہب اس چیز (ہندو مسلم اتحاد) کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ ثابت ہوگا۔

آپ کو یاد ہوگا، کہ میں نے کلکتہ میں اپنی اس گفتگو کا جو اس باب میں حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر کچلو سے ہوئی تھی۔ آپ سے تذکرہ کیا تھا۔ ہندوستان میں حکیم صاحب سے زیادہ سلجھا ہوا کوئی مسلمان نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حکیم صاحب یا کوئی دوسرا مسلمان راہ نما قرآن کی تعلیم کے احکامات پر خطِ تنسیخ کھینچ سکتا ہے! خدا کرے کہ اسلامی قوانین کے مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر میں پہونچا ہوں وہ غلط ہو کیونکہ میرے دل کی کھٹک کو دور کرنے کے لئے اس سے زیادہ عمدہ بات کوئی نہ ہوگی۔ لیکن اگر میرا خیال صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم (ہندو اور مسلمان) انگریز کے مقابلہ کے لئے متحد ہو سکتے ہیں۔ لیکن برطانوی طرزِ حکومت کے مطابق ہندوستان میں نظام حکومت قائم کرنے کے لئے ایسا اتحاد ناممکن نظر آتا ہے۔ اس کا دوسرے لفظوں میں یہ مطلب ہوگا کہ

ہم ہندوستان میں جمہوری طرز حکومت قائم نہیں کر سکتے تو پھر اس کا علاج کیا ہے ؟
میں ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں سے خائف نہیں ہوں۔ لیکن ہم ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں اور اُن کے ساتھ افغانستان وسط ایشیا، عرب عراق اور ترکی کے مسلح لشکروں کی تاب نہ لا سکیں گے۔ میں تہ دل سے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کا قائل ہوں۔ اس کے لئے میں مسلمان راہ نماؤں پر اعتماد کرنے کو بھی تیار ہوں۔ لیکن قرآن و حدیث کے احکام کو ہم کیا کریں گے ؟ مسلمان راہ نمان پر تو خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتے۔ تو پھر کیا ہماری یہ تباہی قضاء مبرم ہے ؟ امید ہے کہ ایسا نہ ہوگا۔ اور آپ کا ذہن رسا اور قلب بصیر اس مشکل کا کوئی حل تجویز کر سکے گا۔"

چنانچہ اس طرح رفتہ رفتہ فضا ہموار ہوتی گئی۔ اس آہنی عزم والے انسان کے سامنے مخالفت کے پورے ہجوم کو جھکنا پڑا اور زمانے کو اپنا دھارا اس کی منشاء کے مطابق بدلنا پڑا۔ اور ہندو۔ انگریز اور خود مسلمان کے اس جمِ غفیر کی مخالفت کے علی الرغم ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آگیا۔

پاکستان بن گیا

"کامیاب زندگی" کا جو معیار ہم نے شروع میں پیش کیا تھا، آپ اسے سامنے لائیے اور دیکھئے کہ اس زمانے میں اس مردِ مجاہد کی زندگی سے زیادہ کامیاب زندگی کس اور کی بھی کہلا سکتی ہے ؟ اس کے شعور نے جب آنکھ کھولی تو پورے ماحول کو اپنے مقصد کے خلاف پایا۔ اور جب اس نے اپنی طبیعی آنکھ بند کی تو سارا ماحول اس کی منشاء کے قالب میں ڈھلا ہوا تھا۔ قابلِ صد رشک ہے ایسی زندگی اور در خود ہزار تبریک و تہنیت ہے ایسی موت۔

مرگے کہ زندگانی باد آرزو کند

یہ زندگی وہ ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

یہ زندگی، کوہکن کی زندگی سے بھی زیادہ کامیاب ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس نے خارہ شگافی ضرور کی تھی لیکن جوئے شیر نہیں لا سکا تھا۔ اور یہ کوہکن ہے کہ جس کی جوئے شیر ہمارے۔ آپ کے اور آنے والی نسلوں تک کے لئے زندگی اور شادابی کا سرچشمہ ہے

لیکن (صد افسوس کہ) جو لوگ تحریک پاکستان کے مخالف تھے، پاکستان بن جانے کے بعد بھی وہ اپنی آتشِ حسد و انتقام کو ٹھنڈا نہیں کر سکے۔ چنانچہ مودودی صاحب کے رسالہ ترجمان القرآن نے اگست ۱۹۴۸ء میں تحریک پاکستان کے ماضی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ

اس پورے گروہ میں ایک کو بھی نہ نکالا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔
ساری جماعت بازیگروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں
کھا کر دُنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی
رہی سہی عزت خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے تھے۔

ٹھیک ہے۔ کوہکن درحقیقت وہ تھے جو ساری عمر مطالبہ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے اور جب پاکستان بن گیا تو سب سے پہلے یہاں آ پہنچے باقی رہا یہ کہ دنیا نے اس "بازیگر" کا تماشا دیکھ کر کیا کہا تھا،

خراجِ تحسین اس کے متعلق زیادہ نہیں تو چند ایک کلمات تحسین و تبریک سُن لیجئے جو قائداعظمؒ کی وفات پر بیساختہ ان لوگوں کی زبان پر آ گئے۔ دنیا کے عظیم ترین اخبار۔ لنڈن ٹائمز نے لکھا۔

قائداعظم نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوے
کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی
جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے ان کے تمام خیالات ہیرے
کی طرح قیمتی مگر سخت۔ واضح۔ اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو
لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہ تھی بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو اپنا ہدف بناتے تھے
اس پر براہ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابل
تسخیر حریف تھے۔

بلبل ہند سروجنی نیڈو نے ان کی عظمت پر نذرِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا

وہ زندگی کے حقائق کو جانچنے۔ پرکھنے اور تسلیم کرنے میں بڑے محتاط
اور غیر جانبدار۔ معاملات میں سوجھ بوجھ اور سلامت روی کے مظہر۔
مگر حقیقی مقصد کے لئے ناقابل شکست چٹان تھے۔

امریکہ کے سابق صدر مسٹر ٹرومین نے کہا۔

دولتِ پاکستان کا معمار۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت
کا بانی۔ مجھے یقین ہے کہ مسٹر جناح کی غیر معمولی قیادت کی یاد، حکومت
پاکستان اور اس کے عوام کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

اور اُس وقت کے مملکت ایران کے سفیر۔ آقائے علی اصغر حکمت نے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا

ایسے عظیم الشان انسان آسمان کے ان ستاروں کی طرح ہیں جن کی روشنی ہم تک
بعید از قیاس فاصلے طے کر کے پہنچتی ہے۔ اور اگرچہ وہ انسانوں کی نگاہوں سے
اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن ان کے نور سے ہمیشہ کسب فیض کیا جا سکتا ہے۔
قائد اعظمؒ کی شخصیت آئندہ نسلوں کے لئے مینارۂ نور کا کام دے گی۔

یہ ہے برادران عزیز! وہ زندگی جس کی کامیابی کی شہادت دنیا اس طرح دے رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ افراد آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ واقعات رونما ہوتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں۔ وقت کے دریا کا جو پانی آگے چلا جاتا ہے وہ واپس نہیں آتا۔ یہ سب آنی اور فانی ہوتے ہیں۔

اول و آخر فنا - باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو - منزلِ آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فراغ
عشق ہے اصلِ حیات - مرگ ہے اس پر حرام

پاکستان، اسی مرد خدا کے عمل عشق کا وہ نقش ہے جس میں رنگ ثبات و دوام جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام او

اور اسی کو کہتے ہیں برادران عزیز! کامیاب زندگی۔

اعتذار

ہمیں بجد ندامت ہے کہ طلوع اسلام کے گزشتہ شمارہ کی کتابت بڑی خراب تھی اور اس میں غلطیاں بھی بہت سی رہ گئیں۔ ہمارا سابقہ کاتب چلا گیا تھا اور اُس پرچہ کی کتابت افراتفری میں کرانی پڑی۔

(۲) اُس شمارہ کے صفحہ ۰، پر اکرام صاحب کی کتاب کا نام بھی غلط چھپ گیا۔ اُس کتاب کا نام ہے۔

(HISTORY OF MUSLIM CIVILISATION)

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔

بقیہ حقائق و عبر

یہ کہا ہے کہ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (۱۶/۱۱۶)

"یونہی اس قسم کی جھوٹی باتیں نہ کہتے پھرا کرو کہ یہ حرام ہے اور یہ حلال اور اس طرح خدا کے سر وہ کچھ منڈھ دو جو اس نے نہیں کہا۔ یاد رکھئے۔ خدا کے مقابلہ میں فقہا و علماء کی جماعت تو ایک طرف، پوری کی پوری نوع انسانی بھی کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ فقہاء و علماء کو یہی درجہ دینا ہی تو تھا جس سے حضور نبی اکرمؐ نے اس شدت سے منع فرمایا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ دیکھو! تم بنی اسرائیل کی طرح اپنے علماء و مشائخ کو خدا نہ بنا لینا۔ عرض کیا گیا کہ وہ لوگ اپنے علماء و مشائخ کی پرستش تو نہیں کرتے۔ پھر انہوں نے انہیں خدا کس طرح بنا لیا ہے، ارشاد ہوا کہ کیا یہ بات نہیں کہ وہ جس چیز کو حرام کہہ دیتے ہیں اسے حرام سمجھ لیا جاتا ہے اور جس چیز کو حلال کہہ دیتے ہیں اسے حلال تصور کر لیا جاتا ہے۔ یہی تو انہیں خدا بنا لینا ہے!

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ اگر بنی اسرائیل کے علماء و مشائخ کو یہ خدائی اختیارات دے دینا انہیں خدا بنا لینا تھا تو کیا امتِ مسلمہ کے علماء و فقہاء کو بعینہٖ یہ اختیار دے دینا انہیں خدا بنا لینے کے مرادف نہیں! جو بات وہاں شرک تھی (اور اسے شرک لسانِ نبوتؐ نے قرار دیا تھا اور یہ قرآن کی تعلیم کے عین مطابق تھا) وہی بات ہمارے ہاں توحید کس طرح بن سکتی ہے؟

ہم اربابِ حکومت۔ اراکین اسمبلی اور ملک کے دوسرے دانشمند طبقہ سے پرزور درخواست کریں گے کہ وہ عائلی قوانین کے مسئلہ کو بازیچۂ اطفال نہ بننے دیں بلکہ اس کی اہمیت پر نہایت سنجیدگی اور متانت سے غور کریں۔ اور بجائے اس کے کہ انہیں پھر سے اسی دلدل کی طرف لے جائیں جس سے انہیں اس مشکل اور مصیبت سے نکالا تھا انہیں کلیتہً قرآن کے مطابق بنانے کے لئے کوشش کریں۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عائلی قوانین کے ضمن میں ہی کہا تھا کہ لَا تَتَّخِذُوْا آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا (۲/۲۳۱) قوانین خداوندی کو مذاق نہ بنا لیا کرو۔ کتنی سخت وعید ہے جو قرآن کی اس آیت میں پوشیدہ ہے اور ہم کس طرح وہی کچھ کر رہے ہیں جس سے ہمیں یوں روکا گیا تھا

تازہ ترین پیش کش

اسلام کیا ہے

تفصیل ٹائیٹل صفحہ ۲ پر دیکھئے

ایک ضروری اعلان

شروع ہی سے انتظام یہ تھا کہ پرویز صاحب کی تمام کتابیں، ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے شائع ہوتی تھیں اور وہی انہیں فروخت کرتا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں جب میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ قائم ہوئی تو انتظامی سہولتوں کی غرض سے ان کتابوں کی طباعت و فروخت کا انتظام اُس کے سپرد کر دیا گیا۔ لیکن یہ تجربہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ اس لئے اب وہی پہلا طریق دوبارہ اختیار کر لیا گیا ہے۔ یعنی اب پرویز صاحب کی جملہ تصانیف کی اشاعت و فروخت، ادارۂ طلوع اسلام ہی کی طرف سے ہوگی (مفہوم القرآن البتہ فی الحال میزان پبلیکیشنز کی طرف سے شائع ہوگا)۔ واضح رہے کہ میزان پبلیکیشنز ایک جداگانہ کاروباری ادارہ ہے، جسے ادارۂ طلوع اسلام اور اس کی تحریک سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے خاص طور پر ذہن میں رکھئے کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر احباب اس باب میں غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

۲۔ ادارہ طلوع اسلام نے پیشگی خریداران کی ایک اسکیم بھی جاری کی تھی۔ یعنی جو احباب ایک سو روپیہ پیشگی جمع کرا دیتے تھے ان کا حساب کھول لیا جاتا تھا اور ادارہ کی ہر کتاب شائع ہونے پر انہیں بھیجدی جاتی تھی اور محصول ڈاک ادارہ خود ادا کرتا تھا۔ یہ اسکیم دوبارہ جاری کر دی گئی ہے۔ جو احباب اس میں شریک ہونا چاہیں وہ مبلغ ایک سو روپیہ (یکمشت یا چار ماہانہ اقساط میں) ارسال فرما دیں۔ کتابوں کی قیمت اور رسالہ کا چندہ اس سے محسوب کر لیا جایا کریگا۔ واضح رہے کہ ہماری اس اسکیم کا میزان پبلیکیشنز کی پیشگی خریداران کی اسکیم سے کوئی تعلق نہیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵۰ - بی ۔ گلبرگ

لاہور

پاکستان کا مستقبل

قائد عسکری انقلاب کی زبان سے

(بتقریب یوم انقلاب)

پاکستان کے حصول و قیام کی تحریک کس انقلاب عظیم کی دعوت لئے منظر عام پہ آئی۔ کروڑوں مسلمانوں نے کس جوش و خروش سے اس دعوت انقلاب کو لبیک کہا۔ سرزمین ایشیا کی اس انقلاب آفریں سیاسی تحریک سے ملت اسلامیہ کی کس قدر خوش آئند امنگیں اور حیات انگیز عزائم وابستہ تھے یہ سب کچھ آج ہماری تاریخ کا ایک قابل فخر باب قرار پا چکا ہے اور یہ داستان جہاد اس حقیقت کی شہادت دے رہی ہے کہ جب ایک قوم اپنے لئے جداگانہ مملکت کے قیام اور اس مملکت میں دین خداوندی کی کارفرمائی کی مقدس آرزوئیں اور پاکیزہ عزائم لے کر اٹھتی ہے تو زندگی کی کامرانیاں اور فتحمندیاں کس طرح آگے بڑھ کر اس کے قدم چوم لیتی ہیں۔ وہ کس فاتحانہ جاہ و جلال مشکلات و موانعات کے پہاڑوں کو روند کر آگے بڑھتی ہے اور بڑی سے بڑی منظم اور مخالف قوتیں اس کے مقابلے میں ہزیمت اور شکست سے دوچار ہوتی ہیں۔

یہ سب کچھ ایک افسانہ نہیں بلکہ ہماری حیات اجتماعی کی وہ جیتی جاگتی حقیقت ہے جس کی تکمیل ہمارے اپنے ہاتھوں سے ہوئی۔ ہم نے حیات ملی کی بازآفرینی کے لئے ایک خاکہ ترتیب دیا اور وحدت فکر و عمل کی معجز نمائیوں سے اس میں وہ رنگ بھرا جس نے اسے مملکت پاکستان کا محسوس و مشہود پیکر عطا کیا۔ لیکن ہمیں یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ ہماری مملکت کا یہ پس منظر جس قدر وجہ شادابی و قلب و نگاہ ہے اسی قدر اس مملکت کا وہ دور باعث رنج و الم اور موجب شرم و ندامت بھی جس کا آغاز بانی مملکت قائداعظم محمد علی جناح کے سانحہ رحلت سے ہوا اور اس نے

کم و بیش دس برس تک ہماری حیات اجتماعی میں سیاسی انتشار، ذہنی شکست اور مایوسی کی وہ ویرانیاں برپا کیں جو ہمیں کشاں کشاں ہلاکت کے جہنم کی طرف ہانکے چلی گئیں۔

قائد اعظمؒ کی باوقار اور پر جلال شخصیت کے رخصت ہوتے ہی سیاسیین کا برسر اقتدار طبقہ اپنی من مانی کارپردازیوں اور کھیل کھیلنے کے لئے پوری طرح آزاد (بلکہ بے لگام) ہوگیا۔ مملکت کے ایوان ہوس اقتدار کی فساد انگیز سازشوں کے نشیمن بن گئے۔ ایک دوسرے کے خلاف گٹھ جوڑ کی مہم تیز تر ہوتی گئی۔ صوبائی اور مرکزی اسمبلی ہال جہاں مملکت کے امن و سالمیت، بقا و استحکام اور نشو و ارتقاء کے لئے قانون سازی کے اہم فریضہ کی ادائیگی مقصود تھی، ہنگامہ بازی، شور و شر اور سر پھٹول کی رزمگاہ قرار پا گئے۔ جہاں چوٹی کے سیاست دان ایک دوسرے کے خلاف اپنی تقریروں میں مسلسل الزام بازیوں کے کچے چٹھے سنائے جا رہے تھے۔ نعرے بازیوں کا شعلہ ایوان اسمبلی کو بھاڑ خانہ بنائے ہوئے تھا۔ اسمبلی کا اسپیکر جسکا فریضہ ایوان میں امن و سکون کو برقرار رکھنا ہوتا ہے ان ہنگاموں میں بری طرح بے بس اور معذور دکھائی دیتا تھا۔ اسمبلی کے انتظامی عملے بیکار ہو کر رہ گئے تھے اور معزز اراکین اسمبلی کی خودسری اور ہنگامہ پسندی کی یہ تیزی و تندی اس حد تک آگے بڑھ گئی کہ ایک دن ڈھاکہ کے صوبائی اسمبلی ہال میں آنریبل ڈپٹی سپیکر جو اجلاس کی صدارت کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے، عین مسند صدارت پر جان سے مار دیئے گئے اور ان پر حملہ کرنے کے لئے اسمبلی ہال کے قومی پرچم کا مستول ڈنڈے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ یہ خبر پوری دنیا میں سنی گئی اور دنیا کے مہذب حلقے یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اسلام کے نام پر جو مملکت قائم ہوئی تھی کیا ارباب اقتدار کے نزدیک اس کا یہی حشر مقصود تھا۔

جب مملکت کا برسر اقتدار طبقہ ہوس اقتدار کی ہنگامہ آرائیوں میں اس حد تک بڑھ جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ دنیا میں اس مملکت کو کس نظر سے دیکھا جائیگا اور خود ملک کے اندر عوام کے جذبات و احساسات کی کیا کیفیت ہوگی۔ قوم پر کیا بیت رہی تھی۔ عوام ضروریات زندگی کے معاملہ میں کن پریشانیوں، تلخیوں اور گوناگوں مشکلات سے دوچار تھے، اس پر غور و فکر کرنے کے لئے کسی کو فرصت ہی میسر نہیں تھی۔ کچھ غول بیابانی تھے جو ایک دوسرے کے خلاف دانت تیز کرنے میں مصروف اور سرگرم کار تھے اور اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے ہر ناروا حربہ بروئے کار لایا جا رہا تھا۔ مملکت پاکستان کے نئے وزیر اعظم اپنے حامیوں کی اکثریت برقرار رکھنے کے لئے وزیروں، نائب وزیروں اور پارلیمنٹری سیکرٹریوں کی ایک نئی فوج کی بھرتی اور اس میں برابر اضافہ کئے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ مارشل لا کے نفاذ سے کوئی ایک ہفتہ قبل ان کی کابینہ اور سیکرٹریوں کی تعداد چار درجن سے تجاوز کر چکی تھی اور مزید بھرتی کی افواہیں گرم تھیں۔

یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ مملکت کے عوام مایوسی، بے بسی اور حرماں نصیبی کی فضائے سوزناک میں مجبور

کھڑے تھے اور بے بسی کے عالم میں بازیچہ سیاست کے ان تماشوں پر ٹھنڈی آہیں بھر رہے تھے۔ ان کی زندگیاں خطرے میں تھیں۔ ملت پاکستان کا نصب العین خطرے میں تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مملکت کا مستقبل خطرے میں تھا۔ عوام کی اجتماعی اور انفرادی امنگوں کی کشتی بھنور کی زد میں تھی اور اس کے کھیون ہار، انجام سے بے خبر، ایک دوسرے سے دست بگریباں تھے۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ مایوسی اور نامرادی کی اس فضا میں عوام کی امیدوں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ دم توڑ دیں گے اور سفینۂ ملت کو طوفان ہلاکت سے بچانے کی کوئی امکانی صورت پیدا نہیں ہوگی۔ یہی صورت حال تھی جبکہ مملکت کو موت کی ان ہچکیوں سے بچانے کے لئے طلوع اسلام نے ایک حل تجویز کیا اور شمارہ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے لمعات میں اس کا اعلان کرتے ہوئے یہ لکھا کہ

> سوال یہ ہے کہ ملک میں تشتت و انتشار کے جو شعلے اس وقت بھڑک رہے ہیں ان کا فوری مداوا کیا ہے۔ اگر ہم جذبات سے الگ ہٹ کر سوچیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس دس سال کے تجربے نے ہمیں بتا دیا ہے کہ جب زمام حکومت نااہلوں اور بدکرداروں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو مملکت کا کیا حشر ہو جاتا ہے، اس تجربے سے اب حالت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ خود ارباب حکومت ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ ایک ہی پارٹی کا ایک لیڈر کچھ کہتا ہے دوسرا کچھ۔ ایک ہی کیبنٹ کا ایک وزیر ایک طرف کو جاتا ہے دوسرا دوسری طرف کو۔ وزیر اعظم کچھ کہتا ہے اور اس کے وزراء کچھ اور۔ مرکز سے ایک حکم نافذ ہوتا ہے۔ اور صوبہ کا چیف منسٹر اس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس صورت حالات کو کچھ عرصہ کے لئے اسی طرح رہنے دیا گیا تو حکومت کی مشینری میں انارکی پھیل جائے گی لہٰذا حالات ہمیں خود بخود اس منزل تک لے آئے ہیں جہاں اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ اس جمہوری تماشے کو ختم کر کے ملک میں مارشل لاء کا اعلان کر دیا جائے اور نظم و نسق کو فوج کے مستحکم ہاتھوں میں دیدیا جائے

افواج پاکستان بظاہر بڑی خاموشی لیکن قلبی ہیجان و اضطراب کے عالم میں اپنے محبوب وطن کی اس پریشان کن صورت حال کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ برسر اقتدار سیاسی رہنما خود بخود ہوشمندی سے کام لیں اور اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی یہ توقعات نقش برآب ثابت ہو رہی ہیں اور ملک تباہی کے نازک ترین مقام پر پہنچ گیا ہے تو وہ عزم و استقامت سے آگے بڑھے اس جمہوری تماشے کو ختم کرتے ہوئے مملکت کا نظم و نسق

اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ملک میں ہنگامی صورت حال اور مارشل لاء کے نفاذ کا اعلان ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ہوا، ۲۷ اکتوبر کو بساط سیاست کے آخری مہرے (صدر سکندر مرزا) کو بھی اٹھا کر الگ پھینک دیا گیا۔ جمہوریت کی بساط کہن الٹ دی گئی اور فوج کے کمانڈر ان چیف، جنرل محمد ایوب خان نے اپنے رفقاء کے مشوروں سے نظام حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اور صدر مملکت کی عظیم ذمہ داریاں خود سنبھال لیں۔

نظریہ ظاہر یہ ایک فوجی انقلاب تھا۔ اس سے قبل دنیا کے مختلف ممالک میں جو فوجی انقلاب رونما ہوئے، پاکستانی عوام ان کی کیفیات اور نتائج سے بخوبی آگاہ تھے۔ ان خوفناک انقلابات سے بے محابا قتل و خون ریزی کی جو ہیبت انگیز اور وحشت خیز روایات وابستہ تھیں، ان کا بھی انہیں پورا علم تھا۔ اس لئے فوجی انقلاب کے الفاظ سے ان کے دلوں کی دھڑکنوں کا تیز تر ہو جانا نفسیاتی طور پر لازم تھا۔ لیکن جنرل محمد ایوب خاں کے ہاتھوں یہ انقلاب اس خوش اسلوبی سے سرانجام پایا کہ ملک کے طول و عرض میں کہیں ایک قطرۂ خون تک گرنے کی نوبت نہیں آئی۔ دنیا کی تاریخ میں فوج کے ہاتھوں شاید ہی کبھی اس قدر پرامن انقلاب رونما ہوا ہو جیسا کہ پاکستان میں۔ مارشل لاء کے ناظم اعلیٰ کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی جنرل موصوف نے ریڈیو پاکستان سے یہ اعلان کیا کہ صورت حال پر قابو پاتے ہی نظام مملکت کو آئینی صورت دی جائے گی اور جس قدر جلد ممکن ہوا ملک میں جمہوریت کی بحالی کا اعلان کر دیا جائے گا۔

فوج کے مضبوط ہاتھوں نے ملک کو ہولناک تباہی سے بچا لیا۔ اور عوام کو ان تمام عناصر سے نجات دلا دی جو اپنی محلاتی سازشوں، مفاد پرستیوں، نفع اندوزیوں اور بلیک مارکیٹنگ سے ان کی انفرادی اور اجتماعی توانائیوں کو دیمک کی طرح چاٹتے اور جونکوں کی طرح چوستے چلے جا رہے تھے۔ عسکری انقلاب کی ایک ہی ضرب نے یہ سارے بت پاش پاش کر کے رکھ دیئے۔ یوں سمجھئے کہ پاکستان کی حیات ملی میں یہ قلا کا مرحلہ تھا۔ ورنہ الّا کی صبر آزما منزل اور اس کی ذمہ داریاں ابھی نئے کارفرمایان مملکت کے حسن تدبیر، دور اندیشی اور بلند نگہی کا انتظار کر رہی تھیں ــــ قومی زندگی میں یہ بڑا ہی نازک موڑ تھا۔ میدان جنگ کے معرکہ آراؤں اور دفاع مملکت کے پاسبانوں کو اب ملک کے تعمیری تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا تھا۔ بظاہر ایسا نظر آتا تھا کہ ان تقاضوں کو پورا کرنا سپہ سالاروں کے بس کی بات نہیں۔ ملک کے لئے نئے دستور کی تیاری، حسب ضرورت قوانین کی ترتیب و تدوین، جمہوریت کا ازسرِنو احیاء اور سب سے بڑھ کر حصول پاکستان کے منشاء و مقصود کی شایانِ شان تکمیل عسکری قیادت کو اظہار عجز پر مجبور کر دے گی۔ لیکن یہ سارے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ ملک کے فوجی صدر کو ہنگامی امور سے عہدہ برآ ہونے کے بعد جونہی عوام سے رابطہ قائم کرنے کا موقع ملا انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ جہاں وہ مملکت کے منتہیٰ و مقصود کو عام سیاست دانوں سے کہیں

بہتر سمجھتے ہیں وہاں انہوں نے ایک نظام مملکت کی حیثیت سے اسلام کے اصول و اقدار کا بھی بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اس اسلامی آئیڈیالوجی کے مضمرات پر کافی عبور رکھتے ہیں جسے ہماری مملکت کی تقدیر بننا مقصود تھا۔ چنانچہ اہم امور سے فراغت پاتے ہی جب وہ لاہور پہنچے تو ۱۲ دسمبر ۱۹۵۵ء کو گلستان فاطمہ میں ایک ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے جو کچھ فرمایا اس میں ایک اہم اور بنیادی حقیقت کا اعلان بایں الفاظ کیا۔

خطاب لاہور

اکتوبر کے انقلاب کا فلسفہ وہی تھا جو پاکستان کی تخلیق کا موجب بنا تھا۔ برسوں کی بدنظمی اور بددیانتی نے اس فلسفہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا اور اس تحریک کے اغراض و مقاصد کو داغدار اور زنگ آلود بنا دیا تھا جو تشکیل پاکستان پر منتج ہوئی تھی۔ اب حکومت کے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ ان مقاصد مطامح کو اس دلدل سے نکال کر اس طرح صیقل کیا جائے کہ انہیں اپنی کھوئی ہوئی آب و تاب اور گم گشتہ عزت و عظمت پھر سے نصیب ہو جائے۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۱۳/۱۲/۵۸)

یہ اعلان مختصر سا تھا لیکن جب یہ الفاظ پاکستان کی فضا میں گونجے تو اپنے اجمال و اختصار کے باوجود انہوں نے قوم کی دم توڑتی امنگوں اور افرادِ ملت کی ڈوبتی نبضوں میں نئی زندگی کی ایک لہر دوڑا دی۔ اور ملت کا ہیجان اضطراب اس خوش آئند اطمینان میں بدلتا دکھائی دیا کہ عسکری انقلاب کے قائد اس عظیم فریضہ سے بخوبی آگاہ ہیں جس کی بجا آوری مملکت کی نظریاتی اساس کا ناگزیر تقاضا پہلے دن سے چلا آ رہا ہے۔

راولپنڈی کی تقریر

۶۔ مارچ ۱۹۵۹ء کو راولپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے یہ مزید وضاحت فرمائی کہ

ہمارا سب سے مقدم فریضہ یہ ہے کہ ہم اس آئیڈیالوجی کا احیاء و استحکام عمل میں لائیں جس کی رو سے پاکستان بحیثیت ایک آزاد مملکت کے وجود پذیر ہوا۔ پاکستان ایک خطۂ زمین کا نام نہیں جس میں آٹھ کروڑ نفوس بستے ہیں۔ پاکستان سے ہماری مراد ایک ایسی ملت ہے جو مخصوص اخلاقی اور روحانی اقدار کی امین ہے یہ اقدار اسلام پر مبنی ہیں۔ ہمارے تجدد پسند حضرات کے نزدیک اسلام کا نام لینا فیشن کے خلاف (اور قدامت پرستی کی دلیل) ہے۔ یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان پر ترس کھایا جائے۔ اس کے برعکس یہ امر ہمارے لئے موجب صد ہزار

فخر و مباہات ہونا چاہیئے کہ ہم ایسے مذہب کے پیرو ہیں جو ہمیں اس قسم کی بلند اقدار کی تعلیم دیتا ہے۔ مثلاً خدا ترسی۔ بنی نوع انسان سے محبت، ہمسایہ سے مودت۔ یتامیٰ کی نگہبانی اور غریبوں کی امداد۔ یہ اسلام کی وہ بنیادی اقدار ہیں جن کے بغیر نہ تم اچھے انسان بن سکتے ہو، نہ اچھے پاکستانی۔

(پاکستان ٹائمز ۷۔ مارچ ۱۹۵۶ء)

کمشنرز کانفرنس مری

صدر مملکت مری کی گل پوش وادیوں کی طرف بڑھے اور ۶ جولائی ۱۹۵۹ء کو انہوں نے وہاں کمشنرز کانفرنس میں اسلامی آئیڈیالوجی کی ضرورت و اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا۔

ہمارے سامنے اس وقت دو اہم مسائل ہیں۔ ایک یہ کہ ہم ایک مشترک اسلامی آئیڈیالوجی کے ماتحت لوگوں میں اتحاد پیدا کریں۔ اور اس آئیڈیالوجی کی تشریح و تبیین، عصر حاضر کی زبان میں زمانے کے موجودہ تقاضوں کے مطابق کی جائے۔ اس آئیڈیالوجی کی روح کو اسلام سے کشید کیا جائے۔ اور ہمارا زمانہ جس حد تک ترقی کر چکا ہے اس کی روشنی میں اس کی تعبیر کی جائے۔ اس وقت اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل فکر و نظر حضرات کو دعوت غور و تدبر دی جائے کہ وہ (زندگی کے ان مسائل کا) نہایت معقول حل دریافت کریں۔ دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ملک کا معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ انسانی دل و دماغ کسی آئیڈیالوجی پر، خواہ وہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، کبھی لبیک نہیں کہتا۔ جب تک اسے وقت پر پیٹ بھرنے کا یقین نہ ہو جائے اس لئے اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ روٹی کے مسئلہ پر خاص توجہ دی جائے (پاکستان ٹائمز ۷۔ جولائی ۱۹۵۹ء)

اس وقت تک صدر محمد ایوب خاں نے مختلف مواقع پر مملکت پاکستان کے مقصود و منتہیٰ کے بارے میں جو کچھ کہا وہ اختصار اور اجمال کا انداز لئے ہوئے تھا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ صدر پاکستان اس اجمال کی تفصیل بھی عوام کے سامنے لائیں تاکہ مملکت کا ہر فرد ان بلند مقاصد سے بخوبی آگاہ ہو جنہوں نے آئندہ چل کر محسوس و مشہود پیکروں کی صورت اختیار کرنی ہے۔ چنانچہ مئی ۱۹۵۹ء کے اوائل میں انہیں دارالعلوم ٹنڈو الہ یار میں

دارالعلوم ٹنڈو الہ یار میں

سالانہ جلاس میں، خطاب کرنے کا موقع ملا۔ اس موقع پر مذہبی علماء کی ایک ایک بہت بڑی تعداد شریک اجلاس تھی۔ صدر مملکت یہاں کھل کر منظر عام پر آئے اور انہوں نے پورے اعتماد سے

اسلام کے فکری و نظری اور عملی گوشوں کی نقاب کشائی کی۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا یہ تاریخی خطاب بےحد اہمیت کا حامل تھا کہ علماء حضرات ان کے علم و بصیرت کے اس نکھرے ہوئے حسن انداز پر محو حیرت تھے۔

صدر محترم نے اسلام کے قرن اول کی عالم آرائی کی یاد تازہ کراتے ہوئے فرمایا۔

> کوئی چودہ سو برس کا عرصہ ہوا کہ اسلام فضائے ہستی پر ابر رحمت بن کر نمودار ہوا۔ یہ (مذہب نہیں تھا بلکہ) ایک ترقی پسندانہ تحریک تھی جو اپنے زور دروں سے بڑھنے اور پھیلنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس نے حیات انسانی کو نیا پیکر، اس کی جدوجہد کو نئی تعبیر اور کاروان انسانیت کو نئی منزل عطا کردی۔
>
> (پاکستان ٹائمز ۱۴ مئی ۱۹۵۹ء)

اس کے بعد انہوں نے کہا۔

> جب تک یہ تحریک زندگی کا جزو بنی رہی اس کے متبعین دنیائے سائنس اور عملی علوم میں ایسے ایسے کارنامے دکھاتے رہے جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ بدقسمتی سے کچھ زمانہ گزرنے کے بعد مسلمانوں نے اسلام کو نظری مذہب میں تبدیل کرنے پر اپنی توجہات مرکوز کردیں اور دین بحیثیت تحریک ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ زندگی اور مذہب میں ایک وسیع خلیج پیدا ہوگئی۔ یہ تفریق آج تک ہماری زندگی کو متاثر کئے جا رہی ہے۔ اسلام اس تفریق (یعنی مذہب اور زندگی کی ثنویت) کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ لیکن یہ فطرت کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ خود اسلام کے متبعین اس ثنویت کا شکار ہو کر رہ گئے۔ (ایضاً)

انہوں نے مزید وضاحت فرمائی کہ

> جب زندگی اور مذہب کا رشتہ منقطع ہو جائے تو زندگی تو بہرحال کسی نہ کسی سمت چلتی رہتی ہے لیکن مذہب ایک ایسی بے جان شے بن کر رہ جاتا ہے جس میں نہ لوچ اور لچک باقی رہتی ہے، نہ حرکت اور نمو کی صلاحیت۔ یہ جامد اور متحجر مذہب زندگی کے دوش بدوش چلنے کے بجائے، مسجدوں اور خانقاہوں میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسلام کے ساتھ یہی ہوا۔ انسانیت، سائنس اور فلسفہ میں ترقی کرتے کرتے کہیں پہنچ چکی ہے، لیکن ہمارا مذہب صدیوں سے ایک ہی مقام پر ساکت و صامت کھڑا ہے۔ اسلام کا معجزہ یہ تھا کہ اس نے بت پرستی کا

خاتمہ کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو بُت بنا دیا۔ (ایضاً)

اس کا خطرناک انجام واضح کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

مذہب کو یوں بُت بنا دینے کا ایک خطرناک نتیجہ، جس نے ہماری ملی ذہنیت اور ثقافت پر تباہ کن اثر ڈالا ہے یہ تھا کہ جن لوگوں نے عصر حاضر کی بڑھتی ہوئی ترقیوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے قدم اُٹھایا ان پر دنیا دار مسلمان کی مہر ثبت کر دی گئی۔ اور جو لوگ مذہبی رسومات و روایات کی آڑ لے کر ماضی کی دُنیا میں جمود و سکون کے مجسمے بن کر رہ گئے وہ سچے اور پکے مسلمان کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ، مستقبل کی طرف نگاہ رکھ کر شاہراہِ حیات پر آگے بڑھنے والے اسلام سے منحرف اور برگشتہ شمار ہونے لگے اور ماضی کی طرف دیکھنے والے مقدس دیندار قرار پا گئے۔ ہر نئے اقدام۔ ہر نئی ایجاد۔ ہر نئی تعلیم کے متعلق یہ شور برپا کر دیا گیا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں ہر انقلابی راہ نما کے خلاف کفر کے فتوے لگتے رہے۔ (ایضاً)

اپنے اس دعوے کی شہادت پیش کرتے ہوئے صدر مملکت نے علمائے کرام کو دعوتِ فکر دی کہ

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ ذرا ان خطبات کا خالی الذہن ہو کر جائزہ لیں جو ہمارے ملک کی ہر مسجد میں پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ موجودہ زمانہ کی چھوٹی سے چھوٹی بات پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ بات نئی ہے۔ میرے خیال میں یہ اسلام کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے کہ اس قسم کے بلند اور باعزت دین کو ترقی کا دشمن اور علم و بصیرت کا حریف بنا کر پیش کیا جائے۔ یہ صرف اسلام کے ساتھ ہی ظلم نہیں ہمارے ان نوجوانوں کے ساتھ بھی ظلم ہے جو آج کل کی ماڈرن دنیا میں مسلمان بن کر رہنا چاہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ چیز زندگی اور مذہب دونوں کے ساتھ انتہائی بے انصافی ہے کہ بیسویں صدی کے انسان پر یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ اگر اسے اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنا ہے تو اسے کئی سو برس پیچھے جانا پڑے گا۔ (ایضاً)

اس کے بعد صدر مملکت نے کہا کہ غور طلب بات یہ ہے کہ اسلام جیسا ترقی پسند۔ زندہ دین اس قسم کا جامد مذہب کیسے بن گیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے پہلے اس کی چند وجوہات اشتفہامیہ انداز میں خود ہی بیان کیں۔ انہوں نے کہا۔

(۱) کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حقیقی نصب العین سے بھٹک گئے ہیں اور ایسا معاشرتی اور سیاسی نظام وضع کرنے میں ناکام رہے ہیں جو بدلتے ہوئے تقاضوں اور تغیر پذیر قدروں کے ساتھ چلنے کی سکت رکھتا ؟

(۲) یا ہم نے اپنے ذہن کو جنوں اور فرشتوں کی کہانیاں بنا کر اسے توہم پرستیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ اور اندھی تقلید کا نعرہ بلند کر کے انسان کی تخلیقی آرزوؤں کا راستہ روک دیا ہے۔

(۳) یا اس کی وجہ وہ تصوف ہے جس نے (زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے) ہم میں فرار کی ذہنیت پیدا کر دی ہے۔ اور زندگی کو قبروں اور حجروں میں محبوس کر دیا ہے ؟

(۴) یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے یہ غلط عقیدہ وضع کر رکھا ہے کہ ہم ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اگلی دنیا میں نجات کے حقدار بن سکتے ہیں۔ کیا ہم اس حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ آخرت کی زندگی ہماری اس زندگی کے اعمال کا ثمر ہے اور ہم جنت میں وہی کاٹیں گے جو کچھ ہم دنیا میں بوئیں گے۔ (ایضاً)

ان سوالات کو پیش کرتے ہوئے انہوں نے علماء حضرات کو ایک اہم مشورہ دیا اور فرمایا کہ

یہ سوالات بہت اہم ہیں۔ ہمارے لئے ازبس ضروری ہے کہ ہم ان عناصر کی جڑ کا سراغ لگائیں، جنہوں نے اسلام کی برق آسا، شعلہ صفت روح کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تحقیق میں ہمارے سامنے بہت سی ایسی حقیقتیں آئیں گی جو نہایت تلخ اور ناخوشگوار ہوں گی۔ لیکن ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم تلخیوں اور ناخوشگواریوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یقین محکم کے ساتھ بیباکانہ انداز میں سرگرم جستجو رہیں۔ (ایضاً)

اس کے بعد صدر محترم نے امت میں تفرقہ بازی کے رجحانات کی مذمت کی اور وحدت و اتحاد کی اپیل کرتے ہوئے کہا

عالم اسلام کے شکست و انتشار کا ایک بڑا سبب مذہبی فرقہ بندی ہے۔ غلط یا صحیح، فرقے بہر حال موجود ہیں اور اس حقیقت سے صرف نظر کرنا حماقت ہے۔ اگر یہ بحث چھیڑ دی جائے کہ کون سا فرقہ حق پر ہے اور کون سا باطل پر، تو اس کا نتیجہ تخریب کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے صحیح طریق یہ ہے کہ مختلف فرقوں

> کے اختلافی نکات کو ابھارنے کے بجائے ان امور پر زور دیا جائے جو ان میں مشترک ہیں، کیا یہ ٹھیک نہ ہوگا کہ ایک دوسرے کی نکتہ چینی کرنے کی بجائے ہم اس پر زور دیں کہ اصل و بنیاد کے اعتبار سے ہم سب ایک ہیں۔ اس لئے کہ ہم سب ایک خدا، ایک رسول اور ایک کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ (ایضاً)

ان اندرونی خرابیوں کے بعد صدر مملکت نے کمیونزم کے اس بیرونی خطرہ کا ذکر کیا جو اسلام کے لئے بڑا چیلنج ہے۔ انہوں نے کہا کہ

> آج دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے اور ان کی باہمی کشمکش آئیڈیالوجی پر مبنی ہے۔ کمیونزم تہیہ کر چکی ہے کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی تمام دنیا پر مسلط کر دے۔ مذہب کمیونزم کا کوئی موثر اور مکمل جواب نہیں پیش کر سکا۔ اس لئے کہ اس کی آئیڈیالوجی بنیادی طور پر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو اقدار مادیت سے نمودار ہوتی ہیں، نظام کائنات میں ان کا بھی ایک مقام ہے۔ لیکن وہ ایسی اہم نہیں کہ نوع انسانی ان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ ان حالات میں کمیونزم کا ایک اور صرف ایک جواب ہے اور وہ جواب اسلام سے مل سکتا ہے۔ کمیونزم کا فلسفہ اور مغرب کی مادی اقتدار (کی کشمکش) میں صرف اسلام ہی وہ نظری آئیڈیالوجی پیش کر سکتا ہے جو روح انسانیت کو ہلاکت سے بچا سکتی ہے۔ (ایضاً)

خطرہ کی روک تھام کے سلسلے میں انہوں نے فرمایا۔

> کمیونزم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کو ماضی کے خلوت کدوں سے نکال کر عصر حاضر کی روشنی اور زبان میں پیش کیا جائے۔ اسے صرف ایک نظری آئیڈیالوجی کی حیثیت سے پیش نہ کیا جائے بلکہ ایک تمدنی، سیاسی، معاشی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ یہی اسلام کی صحیح اور بنیادی پوزیشن ہے۔ (ایضاً)

پاک جمہوریت کا دورہ

پاکستان کے مستقبل کی تعمیر کے سلسلے میں مختلف مواقع پر صدر محمد ایوب خان کے خیالات منظر عام پر آتے رہے اور ان سے ہر باشعور پاکستانی نے محسوس کیا کہ صدر مملکت کاروان ملت کو اسی منزل مقصود کی طرف لے جانا چاہتے ہیں جو اس مملکت کے حصول کا حقیقی منشا و مقصد تھی۔ اسی دوران میں انہوں نے ایک سپیشل ٹرین (پاک جمہوریت) کے ذریعے ملک کے دورے کی ضرورت محسوس کی۔ ... طرح

براہ راست جگہ بجگہ ملک کے عوام کو صاف اور واشگاف انداز میں یہ بتانا چاہتے تھے کہ ان کی حکومت کن مقاصد عالیہ کو لے کر آگے بڑھ رہی ہے۔ دستور مملکت کی تدوین میں وہ کیونکر اسلامی اصول و اقدار کو بروئے کار لائے گی اور ان غیر متبدل اصول و اقدار کی پابندی کرتے ہوئے وہ کس طرح ملک کے لئے جزئیاتی قوانین مرتب کریگی۔ دسمبر ۱۹۵۹ء کے دوسرے ہفتے ان کے دورے کا آغاز ہوا اور ۱۷ دسمبر کو ملتان میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

مجھے یقین واثق ہے کہ ہمارے لئے جمہوریت نہایت ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پاکستان میں کس انداز کی جمہوریت کی ضرورت ہے کیا مغربی انداز کی جمہوریت (جو وہاں کامیابی سے چل رہی ہے) ہمارے لئے موزوں ہوگی؟ میرا خیال ہے کہ ہمارے تجربے نے یہ واضح کر دیا ہے کہ مغربی قالب کی جمہوریت ہمارے ہاں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہمارے لئے ایسی جمہوریت کی ضرورت ہے جسے ہم سمجھ سکیں اور کامیابی سے چلا سکیں

(پاکستان ٹائمز ۱۸۔ دسمبر ۱۹۵۹ء)

دوسرے مقام پر انھوں نے فرمایا۔

جہاں تک اسلامی اصولوں کا تعلق ہے، پاکستان کا دستور یقیناً ان کا آئینہ دار ہوگا۔ لیکن (یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ) اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں اور ان کی جزئیات، تفصیلات اور طریقے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان جزئیات کو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔ (ایضاً)

ملتان کی تقریر میں انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ

حکومت اس تجویز پر غور کر رہی ہے کہ دیہات کی مساجد کو پرائمری اسکولوں کے لئے استعمال کیا جائے۔ اور ائمہ مساجد کو ان اسکولوں میں ٹیچر مقرر کر دیا جائے۔ اس میں دشواری یہ ہے کہ تمام ائمہ مساجد پرائمری تک تعلیم دینے کے بھی اہل نہیں ہیں۔ بنیادی جمہوریتوں کا ایک فریضہ یہ بھی ہوگا کہ وہ ایسے امام مقرر کریں جو بچوں کو ابتدائی تعلیم دے سکیں۔

اس وقت تو اماموں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نماز پڑھاتے ہیں اور پھر گھر گھر سے روٹیاں مانگتے پھرتے ہیں۔ ایسے ائمہ سے آپ یہ توقع کس طرح کر سکتے ہیں کہ وہ ملت کے تعمیری کاموں میں کوئی حصہ لے سکیں گے۔

(پاکستان ٹائمز ۱۸۔ دسمبر ۱۹۵۹ء)

گجرات میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ

پاکستان ایک آئیڈیالوجی کی بنا پر وجود میں آیا ہے اور وہ آئیڈیالوجی اسلامک ہے۔ اس لئے اس میں شبہ کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی آئیڈیالوجی کا آئینہ دار ہوگا۔ آئین کمیشن ان حضرات پر مشتمل ہوگا جنہیں اسلام کی پوری پوری واقفیت ہو اور جو علوم حاضرہ سے بھی باخبر ہوں اس لئے کہ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے ملک کو تیرہ چودہ سو سال پیچھے دھکیل دیا جائے۔ اگر کمیشن کی سفارشات اس معیار پر پوری نہ اتریں تو کابینہ انہیں کبھی منظور نہیں کرے گی۔ اور اگر بفرض محال کابینہ بھی انہیں منظور کر لے اور پارلیمان دیکھے کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں ہیں تو وہ دو تہائی کی اکثریت سے ان میں تغیر و تبدل کر سکے گی۔ (پاکستان ٹائمز ۲۱ دسمبر ۱۹۵۹ء)

ادارہ تحقیقات اسلامیہ

اسلامیات کے مختلف گوشوں کی تحقیق اور تجزیہ کے سلسلے میں حکومت ایک ادارہ تحقیقات اسلامیہ (انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ) کا قیام عمل میں لا چکی تھی۔ ۱۴۔ جولائی ۱۹۶۰ء کو صدر محمد ایوب خاں نے اس ادارہ کے گورنروں کے اجلاس کا افتتاح کیا اور اس سلسلہ میں بنیادی امور پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

اس امر کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول کون سے ہیں۔ اور جن طریقوں سے ان اصول کو عمل میں لایا گیا تھا وہ کیا ہیں۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ اس باب میں کوئی الجھن باقی نہ رہے کہ اسلام میں کون سی باتیں غیر متبدل ہیں اور کون سی ایسی جن میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔ (پاکستان ٹائمز ۱۵ جولائی ۱۹۶۰ء)

مسلک تقلید اور قدامت پرستی پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ لوگوں سے یہ کہہ دیا گیا کہ وہ کسی بات کا فیصلہ خود نہیں کر سکتے۔ ان سے کہا گیا کہ جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے وہ اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے جائیں (اور عقل و فکر سے کبھی کام نہ لیں) لیکن اب لوگ اس طرح کی اندھی تقلید کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔ (ایضاً)

اور اس کے بعد فرمایا۔

بیس تیس برس کے بعد کوئی شخص تمہاری آواز سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ جب تک تم ایسی بات نہ کہو گے جو عقل عامہ کو اپیل کرے اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرے۔ (ایضاً)

یوم انقلاب ۱۹۶۰ء

۲۶ اکتوبر ۱۹۶۰ء کی شام، عسکری انقلاب کی دوسری سالگرہ کی تقریب پر انہوں نے ریڈیو پر جو پروگرام قوم کے نام نشر فرمایا اس میں اسلامی تصورِ حیات کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

علامہ اقبالؒ نے جن کا شمار عصرِ حاضر میں روحِ اسلام کے بہترین روشن دماغ ترجمانوں میں ہوتا ہے کس قدر سچی بات کہی ہے۔ کہ اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کُلّی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر اور تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ ایک معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر و تبدل کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان نہیں۔ وہ تغیر جسے خود قرآن نے آیاتُ اللہ میں شمار کیا ہے تو اس سے زندگی، جو حتماً متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو سیاسی اور روحانی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ابدی اقدار پر ان کی گرفت نہیں رہی تھی اور گزشتہ کئی صدیوں میں اسلام کی قوت میں جو ضعف آیا ہے تو اس کی وجہ یہی جمود و تعطل تھا۔

اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا وقت آیا ہے کہ ۹ کروڑ مسلمانوں کو اس بات کا موقع ملا ہے کہ وہ اپنے ایمان اور زندگی کے روزمرہ کے مسائل میں امتزاج پیدا کرنے کے پروگرام میں شریک ہو سکیں۔

اسی نکتہ کی مزید نقاب کشائی کرتے ہوئے آگے چل کر فرمایا۔

قرآن کریم کی اہم تعلیمات سے ایک یہ بھی ہے کہ حیات ایک ترقی پذیر مسلسل عملِ تخلیق ہے اس لئے ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل آپ تلاش کرے۔ وہ ایسا کرتے میں اپنے اسلاف (کے علمی سرمایہ) سے راہ نمائی لے لیکن اسلاف کے فیصلے ان کی راہ میں روک نہیں بن سکتے۔ (ایضاً)

اس کے بعد وہ قومی زندگی کے عظیم مقاصد کی طرف آئے اور کہا۔

ہمارے سامنے پہلا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرہ کو از سرِ نو منضبط کریں اور اسلامی

آئیڈیالوجی کو اس کی بنیاد قرار دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقصد تھا جو تخلیق پاکستان کے لئے وجہ جواز قرار پایا تھا۔ اس مقصد کی طرف پہلا قدم اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے قلوب و اذہان کو دو قسم کی نفسیاتی الجھنوں سے آزاد کرائیں۔ ان میں سے ایک الجھن جدید تعلیم کی پیداوار ہے۔ یہ تعلیم ہمارے دور غلامی میں رائج کی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ماں کی ہر شے جس میں دین بھی شامل ہے فیشن کے خلاف سمجھی جانے لگی۔

دوسری الجھن ان جامد عقائد کی پیداوار ہے جنہوں نے دین کی روح کو تعصب، توہم پرستی اور گلا گھونٹ دینے والے خیالات کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب سی دکھائی دے گی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارا یہ (نام نہاد) تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ، دونوں ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ پلیٹ فارم ہے "دینی جہالت" (یعنی دین کے متعلق نہ انہیں کچھ علم ہوتا ہے نہ انہیں)۔ (ایضاً)

سعودی عرب میں

نومبر ۱۹۶۰ء میں صدر محترم نے ممالک اسلامیہ کا دورہ فرمایا۔ اور حجاز اور مصر کے اہم مقامات پر ایسی پُرشکوہ اور حقیقت کش تقاریر کیں جن کی صدائے بازگشت آج تک ان مقامات میں گونجتی ہے۔ انہوں نے ۹ نومبر کو سعودی عرب کے دارالحکومت، ریاض میں ملٹری اکاڈمی کا معائنہ کرتے ہوئے وہاں کے افسروں اور سپاہیوں سے کہا۔

یہ اسلام کا پیغام تھا جس نے ماضی میں مسلمانوں کو اس قدر عظمت اور شوکت عطا کی تھی۔ اگر ہم پھر اسی عظمت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے — اور وہ طریقہ ہے اسلام سے متمسک ہو جانے کا۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو مجھے اس میں قطعاً شبہ نہیں کہ (دنیا کی) امامت پھر ہمارے حصے میں آجائے گی۔ (ڈان، ۱۰ نومبر ۱۹۶۰ء)

۱۴ نومبر کو انہوں نے جدہ میں تقریر کرتے ہوئے مسلم ممالک کو اسلام کی عالمگیر برادری کی تشکیل کی دعوت دی اور فرمایا۔

آج ساری دنیا سیاسی اور مادی آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر اپنے اپنے گروہوں کی تشکیل کر رہی ہے۔ ان تصورات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ تصورات، انسان کی انتہائی منزل کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ اس دنیا میں اور اُخروی زندگی میں (نوع انسان کی) نجات صرف اس آئیڈیالوجی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے جو انسان کے مادی اور روحانی تقاضوں میں صحیح صحیح توازن قائم کر سکے۔ ہم مسلمانوں کی خوش بختی ہے کہ ہمارے پاس وہ آئیڈیالوجی، دین اسلام کی شکل میں موجود ہے۔

مسلم ممالک کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں کی درستی کے بعد اسلام کی عالمگیر برادری کی تشکیل کریں اور اس میں باہمی رقابتوں کو دخیل نہ ہونے دیں۔

(ڈان ۵ نومبر ۱۹۶۰ء)

انہوں نے اپنی جدہ کی تقریر میں یہ بھی کہا تھا کہ

ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سامنے کوئی اخلاقی اور روحانی آئیڈیالوجی ہو جس سے وہ اپنے مادی اور بلند اقدار کے تقاضوں میں توازن قائم کر سکے۔ ہمارے لئے یہ آئیڈیالوجی لازماً اسلام کی ہے۔ یہ امر موجب تاسف ہے کہ لوگ بالعموم اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ مذہب انسان (کے فائدے) کے لئے دیا گیا تھا۔ انسان کو مذہب (کے کسی فائدے) کے لئے نہیں بنایا گیا تھا۔ اس حقیقت کو فراموش کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ مذہب کی قوتوں کو انسان کی خدمت کے لئے استعمال کیا جائے، اسے زندگی کے حقائق سے یکسر الگ کر دیا گیا ہے۔

اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ دین کے اصول غیر متبدل ہوتے ہیں لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طریقے، زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن دیکھنا ضروری ہے کہ) یہ تبدیلی صحت مندانہ ہو۔

پاکستان اس بنیادی مسئلہ کے حل کے لئے امکان بھر کوشش کر رہا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم ایسا آئین مرتب کریں جو ہمارے ایمان FAITH سے ہم آہنگ ہو اور جو لوگوں کو اس قابل بنا دے کہ وہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کو زندگی کے ہر شعبہ میں عملاً نافذ پذیر کر سکیں۔ ہماری دوسری کوشش یہ ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم میں ایسی تبدیلی پیدا کریں جس میں شروع ہی سے دینی اور دنیاوی تعلیم کا سلسلہ دوش بدوش چلے۔

(ڈان ۵ نومبر ۱۹۶۰ء)

اسی تقریر میں انہوں نے آگے چل کر کہا۔

اس ضمن میں سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنے ذہن کو ماضی کے جمود اور تعطل سے آزاد کریں۔ دین کے ہر معاملہ میں دیانتدارانہ اور آزادانہ طور پر پوری پوری تحقیق کریں۔ اسلام پر اس انداز سے عمل کریں کہ وہ اس ایٹمی دور

ہیں زمانے کی برق رفتاری کا ساتھ دے سکے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے ہم اپنے نظام تعلیم میں ایسی انقلابی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں جس سے ہماری آنے والی نسلیں دینی اور دنیاوی تعلیم کے امتزاج سے نہایت اچھے انسان اور نہایت اچھے مسلمان بن سکیں۔ (ایضاً)

سرزمین مصر میں

۶ نومبر کو قاہرہ پہنچ کر ایک تقریر میں اسلامیان عالم کو اسلامی اخوت اور وحدت کی اہمیت یوں یاد دلائی۔

جب تک ہم اسلام کے بنیادی اصولوں سے متمسک رہیں گے، مادی، سیاسی یا مملکتی حدود کا کوئی خیال ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے جدا نہیں کر سکے گا۔ خدا سے میری دعا ہے کہ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو وحدت، مقصد اور یقین کی اس دولت سے مالا مال کر دے جس کا اسلام نے حکم دیا ہے اور جو آج کی دنیا میں، جس میں آئیڈیالوجی کی کشمکش ہو رہی ہے، ان کے نصب العین حیات کا تقاضا ہے

(ڈان۔ ۷ نومبر ۱۹۶۰ء)

اسی تقریر میں آگے چل کر فرمایا۔

جو لوگ ایمان کے رشتے سے باہم دگر پیوست ہوں، وہ ان تمام قوتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو ان میں نزاع اور تشتت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اور جب یہ ایمان اسلام کا عطا کردہ ایمان ہو، تو ان میں باہمی افتراق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اسلام، اختلافات کے مقابلہ میں اخوت، اشتعال انگیزی کے مقابلہ میں نرم روی اور سہار، غلط فہمیوں کے مقابلہ میں باہمی افہام و تفہیم اور غصہ کے مقابلہ میں عفو اور درگذری کی روح ہے۔ (ایضاً)

۹ نومبر کو انہوں نے قاہرہ یونیورسٹی میں ایک معرکہ آرا تقریر کی جس کے دوران میں کہا۔

مسلمان کہیں بھی ہو، وہ اپنے اللہ سے اور خود اپنی ذات سے ایک عہد وفا استوار کرتا ہے، یہ عہد وفا دنیا کی ہر دوسری وفاشعاری کے عہد سے بلند ہے۔ یہ عہد وفا ہے ایمان کا۔ یہی وہ عہد وفا ہے جس کی وجہ سے دنیا کے تمام مسلمان، حکومتوں کے سیاسی اختلافات اور خارجی نزاعات کے علی الرغم، رشتۂ اخوت و مودت میں منسلک نظر آتے ہیں اور خیر سگالی اور خیر اندیشی کی غیر مرئی گرہیں انہیں ایک دوسرے

سے پیوست رکھتی ہیں۔ میری دعا ہے کہ باہمی مودت اور محبت کا یہ وسیع و عمیق چشمہ دن بدن وسیع سے وسیع تر اور عمیق سے عمیق تر ہوتا جائے اور انہیں اس سے محفوظ رکھے کہ وہ اسے، ہنگامی فائدوں یا عارضی مصلحتوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیں۔

باہمی محبت اور اخوت کا نتیجہ یہ ہے کہ الجیریا کے مسلمانوں پر مظالم ہوں، یا فلسطینی پناہ گزینوں پر، کشمیری مسلمانوں کے جانکاہ مصائب ہوں یا اسرائیلی حکومت کی آئے دن کی دھمکیاں (یہ مقامی اثرات نہیں رکھتیں بلکہ) تمام دنیا کے مسلمانوں کے دل میں یکساں جذبات ہمدردی کو بیدار کر دیتی ہیں)

(ڈان - ۱۰ نومبر ۱۹۶۰ء)

قاہرہ یونیورسٹی کی اس تقریر میں انہوں نے مزید یہ وضاحت کی کہ۔

جوں جوں ہم دین کی روح سے دور ہٹتے گئے اور محض رسم پرستی کو دین سمجھ لیا، دین کی اصل حقیقت کی جگہ سطحیت نے لے لی۔ غور و فکر کی جگہ توہم پرستی آگئی اور جرأت تحقیق کی جگہ روایت پرستی کی اندھی تقلید نے سنبھال لی۔ مسلمانوں کو تاج و تخت اور حکومتوں اور سلطنتوں کے چھن جانے سے اس قدر نقصان نہیں ہوا جس قدر نقصان اس سے ہوا کہ ان سے اس دل کی حکومت چھن گئی جس کا شعار آزادانہ تحقیق و کاوش تھا اور اس کی جگہ ان پر عقلی جمود مسلط ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی تو آگے بڑھتی گئی لیکن اسلام کا علم و عمل اس سے صدیوں پیچھے رہ گئے اور وہ دین جس کا مقصود یہ تھا کہ وہ ایک مکمل، متحرک اور حرکت بخش ضابطۂ حیات بنے، محض پوجا پاٹ کی ظواہر پرستی کا پیکر بن کر رہ گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس دنیا میں، جو سرآن آگے بڑھتی جا رہی ہے، مسلمان کی نگاہیں مڑ مڑ کر پیچھے کی طرف جاتی ہیں۔

ہمارے نظام تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اسلام کو توہم پرستی اور تقلید و جمود کے اس جالے سے نکالیں جو اس پر چاروں طرف سے تنا گیا ہے اور عصر حاضر کے علم اور سائنٹفک تحقیقات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اسے آگے بڑھانے جائیں۔ (ڈان ۱۵ نومبر ۱۹۶۰ء)

۷ نومبر کو صدر پاکستان کے اعزاز میں (قاہرہ میں) نیشنل یونین ریلی کا اجتماع ہوا۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا۔

ایک اور مسئلہ بھی ایسا ہے جو میرے خیال میں آپ حضرات کے ذہن رسا کے بھی ایسا ہی قریب ہے جیسا ہم پاکستانیوں کے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام ایک ترقی پسند اور متحرک دین ہے۔ یہ ایک ایسا دین ہے جو عقل و فکر اور غور و تدبر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جو ہمیں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ چلنا سکھاتا ہے۔ لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس دین کے ساتھ کیا بیتی ہے۔ ایک طرف اس دین کو دیکھئے اور دوسری طرف عالمِ اسلام پر نگاہ ڈالئے بات نکھر کر سامنے آجائے گی۔ آج ساری دنیا کے مسلمان سب سے زیادہ پیچھے اور سب سے کم تعلیم یافتہ ہیں۔ کیا یہ صورتِ حالات ایسی تشویش انگیز نہیں کہ ہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس پر غور کریں کہ اس قسم کے دین کے نام لیواؤں کی ایسی حالت کیوں ہو گئی ہے؟ ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے اور اس کے ازالہ کی کیا صورت ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ ہر اس مسلمان کا فریضہ ہے جسے دیدۂ بینا عطا ہوا ہے کہ وہ سوچے کہ ہمارے اس زوال کے اسباب کیا ہیں اور جس نتیجہ پر وہ پہنچے اسے بلا خوف اور بے دھڑک واضح الفاظ میں قوم کے سامنے پیش کر دے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ہمارے مذہبی طبقہ اور مذہبی راہ نماؤں نے مشکلات و مصائب کے ہجوم میں ہماری ملی روایات کے حفظ و بقا کے لئے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ لیکن کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ وہ اس وقت کر رہے ہیں، وہ اس طریق کی طرف ہماری راہ نمائی کر سکتا ہے۔ جس سے ہم زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے قابل ہو سکیں؟ ممکن ہے آپ اس کے جواب میں کہہ دیں کہ ذرا ان سے سلئے یہ بتانا کیا ضرور ہے اور ذرا ہم پر یہ بھی کب لازم ہے کہ ہم زمانے کے تقاضوں کے ساتھ چلیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ قوانینِ فطرت اور خود قرآن کریم ہمیں واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو لوگ اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرتے اور زمانے کے ساتھ نہیں چلتے، آخرالامر تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم زمانے کے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، اپنی کمزوریوں کا اعتراف اور انہیں دور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے تو پھر ہم دوسروں کے غلام بن جائیں گے اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس مرتبہ کی غلامی، سابقہ دور کی غلامی کے مقابلہ میں، بہت زیادہ دیرپا ہوگی۔　　(ڈان - ۱۵ - نومبر ۱۹۶۰ء)

دین کی غرض و غایت اور اسلام کی آئیڈیالوجی کو اس طرح واشگاف کرنے کے بعد انہوں نے پاکستان کا ذکر کیا اور فرمایا کہ

پاکستانی اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ان کا ملک اسلامک آئیڈیالوجی کی تخلیق ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ ہماری ہستی کی سب سے مقدم وجہ جواز ہی یہی ہے اور اگر ہم اس آئیڈیالوجی کو بصدق دل قبول نہیں کرتے تو ہم کبھی سچے پاکستانی نہیں بن سکتے یہ وجہ ہے کہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہم حتی الامکان عصر حاضر کی سائنٹیفک تحقیقات کے ضمن میں اسلام کا صحیح صحیح مطالعہ کریں۔ (ایضاً)

عیدالاضحیٰ کی تقریر

۱۹۶۱ء میں عیدالاضحیٰ کی تقریب پر، صدر محترم نے، ملک کے نام ایک تقریر نشر فرمائی جس میں انہوں نے فرمایا۔

عزیز ہم وطنو! عید مبارک! عیدالاضحیٰ کا مبارک دن اس عظیم الشان قربانی کی یادگار ہے جو محض اللہ کی راہ میں اس کی خوشنودی کے لئے مکمل بے غرضی کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔

اگر مسلمانوں نے اس جذبہ کی صحیح روح پر عمل کیا ہوتا تو آج دنیا میں ان کی حالت کچھ اور ہوتی۔ لیکن قربانی کی رسم تو باقی رہ گئی اور اس کے پیچھے جو ابراہیمی روح تھی وہ روایات میں کھو گئی۔ یہ حال صرف قربانی کی رسم ہی کا نہیں ہوا بلکہ اسلام کے بہت سے دوسرے سنہری اصولوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ صدیوں سے ہم نے مذہب کو علمی زیادہ اور عملی کم بنا رکھا ہے۔ علم میں بھی ہم نے مذہب کی روح کو روایات میں جکڑ کر ماضی کا قیدی بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے اکثر لوگ کتابی اسلام سے تو ضرور کچھ نہ کچھ واقف ہیں لیکن مذہب کے اس پہلو سے بہت دور ہیں جو زندگی کا لازمی حصہ ہونا چاہیئے۔

قدامت پرستی کی چار دیواری

بڑھتی ہوئی تعلیم اور ترقی کے اس زمانے میں زندگی کی رفتار بے حد تیز ہو گئی ہے اور انسان کا ذہن بہت سی ان حدود سے آزاد ہو گیا ہے جو بے علمی کی وجہ سے قائم تھیں۔ آج کا ذہن صرف اسی بات کو قبول کرے گا جو سائنس اور علم کے اس عجیب و غریب دور میں اسے مطمئن کر سکے۔ اگر ہم نے مذہب کو ماضی کی چار دیواری میں قید رکھا تو یہ خطرہ ہے کہ حال و مستقبل کے بہت سے لوگ لادینی کا شکار ہو جائیں گے۔

عزیز ہم وطنو! ہم لوگ اس بات پر فخر کرنے کے عادی ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں ہر زمانے اور ہر جائز ترقی کا ساتھ دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن یہ دعویٰ صرف بیان کر دینے سے ہی ثابت نہیں ہو سکتا، بلکہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو عملی طور پر بھی ثابت کر کے دکھائیں۔ اس مقصد کیلئے دو باتیں بہت لازمی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اسلام کے اصولوں کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور دوسرے یہ کہ اپنے زمانے اور ماحول کی روشنی میں ان پر عمل کرنے کی راہیں تلاش کریں۔ (ایضاً)

قرآن کریم کے ابدی اصولوں کی روشنی میں

جہاں تک اسلام کے اصولوں کا تعلق ہے اسے خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگرچہ قرآن شریف تبرک کے طور پر پڑھا اور پڑھایا تو ضرور جاتا ہے، لیکن اس کو سمجھنے کی زیادہ کوشش نہیں کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے عقائد اور عمل میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی ہے۔ اصول خواہ دینی ہوں یا دنیوی، اس لئے نہیں بنائے جاتے کہ ان کو بت بنا کر انکی پرستش کی جائے۔ اصول تو اس لئے بنتے ہیں کہ ان پر صحیح طور پر عمل کیا جائے۔ اصول اپنی جگہ بنیادی ہوتے ہیں۔ اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ لیکن اصولوں پر چلنے کے انداز ہر زمانے اور ہر ماحول کے مطابق ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو علم اور عمل الگ الگ راہوں پر چلنے لگتے ہیں اور ان میں کوئی رابطہ قائم نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر جب بجلی پیدا کرنے کے اصول ایجاد ہوا تو پہلے پہل جو شخص ہاتھ لگاتا تھا صرف جھٹکے لگتے تھے۔ پھر جیسے جیسے انسان کا علم بڑھتا گیا ویسے ویسے بجلی کو استعمال کرنے کے نئے طریقے بھی دریافت ہوتے گئے۔ چنانچہ آج اس بجلی سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ پنکھے چلتے ہیں۔ وائرلیس اور ٹیلی ویژن کی لہریں پھیلتی ہیں اور بڑی طاقت والے ہوائی جہاز اڑتے ہیں۔ ان سب ترقیوں کے باوجود بجلی کی حقیقت اور اس کو بنانے کے بنیادی اصول قائم ہیں ان میں کسی قسم کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔

مفتی صاحب کے خط کے جواب میں

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے صدر محترم کو عائلی قوانین کے سلسلے میں ایک خط لکھا تھا جس کے جواب کے اخیر میں صدر مملکت

نے ۱ جون ۱۹۶۱ء میں لکھا

اصولوں سے انحراف تو قطعی ناممکن ہے لیکن ان پر عمل کے طریق کار کو تقاضائے وقت کے ساتھ ساتھ وضع کرنا صرف حکومت کا ہی نہیں بلکہ خود علمائے کرام کا بھی فرض ہے۔ اس بات کو میں "فرض" اس لئے کہتا ہوں کہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم حال اور مستقبل کے دور میں زندگی کو لادینی کے غلبے سے بچا سکتے ہیں۔

نئے تقاضوں کی اہمیت ایک سیدھے سادے مسلمان کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ سنت، حدیث اور فقہ کی روشنی میں ہمیں عمل کے ایسے طریقے کار وضع کرنے پڑیں گے۔ جو آج کل کی دنیا میں قابلِ عمل اور موجودہ اذہان کے لئے قابلِ قبول ہوں۔ اگر ہم نے اس میں کوتاہی کی تو ہم خود زندگی اور مذہب کے درمیان ایک گہری خلیج حائل کرنے کے مجرم ہوں گے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی مروجہ روش سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ بات ان طبقوں پر بہت گراں گزرتی ہے جو اس کے عادی ہو چکے تھے۔ یا جن کے لئے وہ روش کسی قسم کے ذاتی یا جماعتی منفعت یا وقار کا باعث تھی۔ لیکن سچے جذبہ خدمت کا یہی تقاضا ہے کہ ایسی ذہنی یا نفسیاتی رکاوٹوں کو ترقی کی راہ کا روڑا نہ بننے دیا جائے۔

خواتین کے اجلاس میں ۲۵ دسمبر ۱۹۶۱ء کو کراچی میں بنیادی جمہوری اداروں کی خواتین کی طرف سے ایک سپاسنامہ کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے صدر محترم نے فرمایا۔

قرآنِ کریم نے ہمیں جو بنیادی اصول دیئے ہیں وہ ابدی ہیں۔ لیکن ان کی تشریح وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ہونی چاہیے۔ اور معاشرہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مقتضیاتِ زمانہ کے مطابق ان پر عمل کرے۔ (یاد رکھئے) صرف وہی قومیں زندہ رہ سکتی ہیں جن میں عقل و استدلال سے کام لینے کی بصیرت موجود ہے۔

(بحوالہ نوائے وقت۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۶۱ء)

یوم انقلاب ۱۹۶۱ء انہوں نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۱ء کی شام ملت کے نام اپنے پیغام میں فرمایا۔ جیسا کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے، ہمارے آئین کا بنیادی پتھر اسلام کی روح ہوگا۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا اور اسی کی خاطر اسے حاصل کیا۔ ہماری بقا اور فلاح کا راز، اسی اسلامی روح کے ساتھ

دیانتداری سے تمسک ہی ہے۔ ہمارے ملکی نظم و ضبط، بلکہ ہماری پوری زندگی میں اسلام ہی ہمارا پیش نہاد ہے اور میری کوشش یہ ہے کہ میں کم از کم ایک ایسی مشینری کی بنیاد رکھ دوں جو ہمارے ایمان کی روح کو کشید کر کے اسے ہماری عملی زندگی میں پھونک دے جس سے ہمیں روشنی اور ہدایت اور فلاح و سعادت نصیب ہو۔

اس حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ دین کے بنیادی اصولوں کے علاوہ، انسانی معاملات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو ناقابلِ تغیر و تبدل ہو۔

(پاکستان ٹائمز، ۲۷ اپریل ۶۱ء)

پھر انہوں نے ۹ راکتوبر ۱۹۶۳ء کو جامعہ اسلامیہ بہاولپور کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی تقریر میں فرمایا۔

جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے افتتاح پر

ملک کے مستقبل کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے مذہبی ادارے صحیح خطوط پر منظم کئے جائیں پاکستان اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا تھا ہم نے اپنے مذہب کے تحفظ کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں دولتِ پاکستان سے نوازا۔ شاید عالمِ اسلام میں پاکستان کے عوام کا مذہب سے زیادہ لگاؤ ہے۔ گزشتہ صدی میں ہمارے علماء کا خیال تھا کہ اسلام کے تحفظ کے لئے مسلمانوں کو انگریزی اور جدید سائنس کی تعلیم سے محروم رکھنا ضروری ہے۔ اسلام اللہ تعالیٰ کا سچا مذہب ہے، اس کے اصول سچے، اور ہر زمانے کیلئے ہیں۔ اسلئے اسے جدید تعلیم یا نئے نظریات سے قطعاً کوئی خطرہ نہیں خوف تو اس چیز کو ہونا چاہیئے جو جھوٹی اور بزدل ہو۔ جو لوگ سچائی پر ہیں انہیں جدید سائنس یا نظریات سے قطعاً کوئی خوف نہیں ہونا چاہیئے۔ نئے نظریات اور جدید سائنس کا مقابلہ کرنیکا یہ طریقہ نہیں کہ ہم اپنے علم کی حدود کے اندر رہیں اور بیرونی اثر و نفوذ سے بالکل قطع تعلق کر لیں صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم جدید علوم اور نظریات کا مطالعہ کریں۔ ہمارا مذہب ہمیں اسبات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم جہاں بھی کوئی اچھائی یا خوبی دیکھیں لے لیں اور برائی کو رد کر دیں۔ قرآن اور سنت میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جسے جدید علوم اور نظریات سے خطرہ لاحق ہو۔ اگر موجودہ وقت کے ہمارے علماء کوئی ایسا فتویٰ دیدیتے ہیں جو بدلے ہوئے حالات میں ہمیں صحیح معلوم نہیں ہوتا تو ہمیں وہ راستہ اختیار کرنے سے کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیئے جسے ہم صحیح سمجھتے ہوں۔ قرآنِ حکیم میں بار بار کہا گیا ہے کہ ہم اپنی عقل اور دانش

سے کام لیں۔ علاوہ ازیں حضور اکرمؐ نے خود اجتہاد کے دروازے کھولے ہیں۔ اگر ہم نے تنگ نظری کا ثبوت دیا اور فرسودہ طریقے اپنائے رکھے۔ تو ہماری مستقبل کی نسلیں اسلام سے اسی طرح دور ہو جائیں گی جس طرح مغربی اقوام اپنے مذہب سے دور ہو گئی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ عمل شروع ہو چکا ہے۔ اس لئے ہمارے مذہبی رہنماؤں اور علماء کا اخلاقی، قومی اور مذہبی فرض ہے کہ وہ اسلام کے اصولوں کو دورِ جدید کی ضروریات پر منطبق کر کے ثابت کریں کہ یہ اصول سچے اور ہر زمانے کے لئے ہیں۔ فرسودہ نظریات سے جو بدلے ہوئے حالات میں کسی کام کے نہیں ہیں۔ سختی سے وابستگی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہماری آئندہ نسلیں مذہب سے دور ہو جائیں گی اور انہیں خوفِ خدا نہیں رہے گا۔ اسلام ایک ترقی پسند مذہب ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ صحابہؓ کرام نے جو عظیم کامیابی حاصل کی وہ اسلام کے اصولوں کی سختی سے پابندی کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے زندگیوں کا آغاز غیر مہذب لوگوں میں کیا وہ آرٹ، ادب اور سائنس کے ماہر اور دنیا کے رہنما بن گئے پھر کیا وجہ ہے کہ اسی اسلام کے پیرو کار آج پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم صحابہ کرامؓ کے نقشِ قدم پر نہیں چل رہے۔ ہم نے اسلام کے اصولوں کو ترک کر دیا ہے۔ اور صرف اسلامی فقہ کو ہی اسلام سمجھتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک بار پھر عوام میں اسلام کی صحیح روح پیدا کی جائے۔

(کوہستان ۱۰ نومبر ۶۲ء)

پاکستان کو برسر اقتدار سیاست دانوں کی تباہ کاریوں سے نجات دلانے اور مملکت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد اکتوبر ۱۹۵۸ء سے صدر محمد ایوب خاں جس صاف، واضح اور نکھرے ہوئے انداز میں اپنا نقطہ نظر ملت پاکستان کے سامنے پیش کرتے چلے آ رہے ہیں، ہم نے اسے بالتفصیل قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس سے قبل بھی ہم کئی بار طلوع اسلام کے کالموں میں صدر مملکت کی طرف سے پیش کردہ ان نظریات و تصورات کو دہرا چکے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ ہماری بصیرت کے مطابق ان کے یہ ارشادات قرآن کریم کے منشاء و مقصود سے مطابقت رکھتے ہیں اور ان کی بنا پر مملکت کی تعمیر جس انداز سے ہوگی وہ ان عظیم القدر تقاضوں کو پورا کریگا جن کی بجا آوری کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا ہے اور چونکہ ایک "سپاہی" جو کچھ کہتا ہے وہ کچھ کر کے بھی دکھاتا ہے اس لئے ہمیں یقین ہے کہ صدر محترم تدریج ان نظریات و تصورات کو عملاً متشکل کر کے پاکستان کو وہ کچھ بنا دیں گے جو کچھ بننے کیلئے اسے وجود میں لایا گیا تھا ہم جانتے ہیں کہ ملک میں جمہوریت کی بحالی ان کے اُن غیر محدود اختیارات کو ختم کرتی تھی جو انہیں مارشل لا کی رو سے حاصل تھے۔ ملک میں کوئی طاقت ایسی نہیں تھی جو انہیں جمہوریت کی بحالی پر مجبور کر سکے۔ اس کے باوجود انہوں نے قوم سے جو وعدہ کیا تھا اُسے

کرنے کا کام

حرف بحرف پورا کر دکھایا۔ اور ایک جمہوری آئین متشکل کرکے عوام کو اپنی نمائندگی کے حقوق واپس لوٹا دئے۔ اگر صدر مملکت یہ کچھ کر سکتے ہیں تو یقیناً وہ ملک میں ایسے معاشرے کا قیام بھی عمل میں لا سکتے ہیں جو ان کے مندرجہ ارشادات کی جیتی جاگتی تصویر ہو اور دین خداوندی کے مقصود و منتہیٰ کو حسن و خوبی سے پورا کر سکے۔

ہم یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ مذہبی پیشوائیت اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوگی۔ اس لئے کہ خدا کے دین میں مذہبی پیشوائیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہوگا کہ اس معاملہ میں ہمت اور جراٴت سے کام لیا جائے۔ اس کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہوگا کہ ہماری نئی نسل کی ذہنی اور قلبی تربیت اس انداز سے ہو کہ وہ دین خداوندی کے منشا و مقصود سے پوری طرح بہرہ ور ہو سکے۔ سکولوں اور کالجوں میں دینیات کے موجودہ رسمی نصاب اس عظیم مقصد کو پورا نہیں کر سکیں گے۔ اصل اور بنیادی تقاضا یہ ہے کہ پورا نصاب تعلیم دین خداوندی کے مستقل اصول و اقدار کی روشنی میں مرتب ہو۔ اور ان تعلیمات کے ذریعے ابھرتی ہوئی نئی نسل کے قلوب و اذہان کی تربیت کا سلسلہ مسلسل اور پیہم جاری رہے۔ سائنس کے علوم ہوں یا فلسفہ۔ آرٹ ہو یا ریاضی۔ غرضیکہ تعلیم کے ہر شعبے میں جو کچھ بطور

تعلیم کا مسئلہ

نصاب ان کے لئے متعین ہو اس کے رگ و ریشے میں یہ حقیقت سرایت کئے ہو کہ ان علوم و فنون کو قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار کے ساتھ کیا تعلق ہے اور ان کے ماحصل کو کس طرح قرآنی اصولوں کی روشنی میں نوع انسان کی بھلائی کے لئے صرف کیا جائے گا۔ یہ حقیقت ان کے دل کی گہرائیوں میں اس طرح اتر جائے کہ ان کے نزدیک حق و باطل، غلط اور صحیح کے پرکھنے کا معیار خدا کی کتاب قرار پا جائے۔ یہی وہ طریق ہے جس سے ہماری آئندہ نسلوں کے فکر و نظر سے مذہبی قدامت پرستی کی وہ اکاس بیل اتر سکے گی جو صدیوں سے امت کے شجر طیب کی ہر شاخ کو خزاں دیدہ بنائے چلی آرہی ہے۔ درخت دن بدن خشک ہوتا چلا جا رہا ہے اور اکاس بیل بڑھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے

روٹی کا مسئلہ

یہ تو رہا ہماری آنے والی نسلوں کا معاملہ، جہاں تک موجودہ معاشرہ کا تعلق ہے، صدر محترم نے (جولائی ۱۹۵۹ء میں) کمشنرز کانفرنس (مری) سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

> انسانی دل و دماغ کسی آئیڈیالوجی پر خواہ وہ کتنی ہی بلندی پر کیوں نہ ہو، کبھی لبیک نہیں کہتا جب تک اسے دو وقت پیٹ بھرنے کا یقین نہ ہو جائے۔ اس لئے اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ روٹی کے مسئلہ پر خاص توجہ دی جائے۔

روٹی کے مسئلہ کے حل کے لئے قرآن کریم نے نہایت صاف اور سیدھے اصول بتائے ہیں۔ یعنی پیداوار کے سرچشمے

چند افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے سواد للسائلین (۵۱/۱۹) " تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے " ہونے چاہئیں۔ اور دولت کی تقسیم اس طرح ہونی چاہئے کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم (۵۹/۷) کہ وہ اوپر ہی اوپر امیروں کے طبقہ ہی میں گردش نہ کرتی رہے۔ اسی سے مملکت اس قابل ہو سکے گی کہ وہ اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے جو خدا کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہے۔ یعنی افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا۔

صدر محترم نے ٹنڈو الہ یار میں علماء کے گروہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

> کمیونزم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کو ماضی کے خلوت کدوں سے نکال کر عصر حاضر کی روشنی اور زبان میں پیش کیا جائے۔ اسے صرف ایک نظری آئیڈیالوجی کی حیثیت سے پیش نہ کیا جائے بلکہ ایک تمدنی، سیاسی، معاشی۔ اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ یہی اسلام کی صحیح اور بنیادی پوزیشن ہے۔

یہ بالکل درست ہے۔ روٹی کے مسئلہ کو اگر خاطر خواہ طریق پر حل نہ کیا جائے تو اس سے معاشرہ میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جسے پُر کرنے کے لئے کمیونزم کا جھکڑ اپنی پوری تندی اور تیزی سے بڑھ اور چڑھ آتا ہے۔ اس کی روک تھام کا وہی طریق ہے جس کی طرف صدر محترم نے اپنی مذکورہ بالا تقریر میں اشارہ کیا تھا۔ یعنی ملک میں قرآن کے معاشی نظام کو عملاً رائج کیا جائے۔ ہمارے مذہبی طبقہ کی طرف سے قرآن کے معاشی نظام کی بھی سخت مخالفت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک اسلام کا معاشی نظام وہ ہے جو ہمارے دور حکومت میں رائج ہوا تھا اور جو خالص سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ چنانچہ قرآنی نظام کی مخالفت میں ان حضرات کی ٹیکنیک یہ ہے کہ جو شخص روٹی کے مسئلہ کو (یا قرآنی نظام معاشی) کی بات کرے، وہ جھٹ سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ کمیونسٹ ہے، حالانکہ قرآن کا نظام کمیونزم کی ضد ہے اور اس کی روک تھام کا کام دیتا ہے)

لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ

(۱) ملک کے موجودہ تعلیمی نظام کو نیچے سے اوپر تک "کلیتہً" بدل کر اس کی جگہ اس نظام کو رائج کیا جائے جو قرآن کی بنیادوں پر استوار ہو۔ اور

(۲) ملک میں قرآن کا معاشی نظام رائج کیا جائے۔

ہمیں امید ہے کہ صدر محترم نے جس طرح اپنی تقاریر و بیانات میں ان مسائل کو نظری طور پر سلجھایا تھا اسی طرح وہ ان کی عملی تشکیل کی طرف بھی بتدریج توجہ دیں گے۔

یہ ہے وہ طریق کار جو پاکستان کو ایسا مستقبل عطا کر سکتا ہے جو منشائے خداوندی کی تکمیل کا ذریعہ ہو اور

(بقیہ صفحہ ۷۰ کے نیچے)

مسلم پرسنل لاء پر نظرِ ثانی

[شروع جنوری ۱۹۶۴ء میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا چھبیسواں اجلاس نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں (۱۰۹۴) ڈیلیگیٹ (۱۴۴) اراکین اور (۸۰) مبصرین شامل ہوئے۔ کانگریس کے دس شعبے تھے جن میں سے ایک شعبہ علوم اسلامیہ سے متعلق تھا۔ اس کے علاوہ دو سمپوزیم ہوئے جن میں سے ایک کا موضوع تھا "مسلم پرسنل لاء پر نظرِ ثانی"۔ اس سمپوزیم کی روئداد، محترم عبد اللطیف اعظمی صاحب کے قلم سے ماہنامہ جامعہ (دہلی) [illegible] ئی ہے جسے ہم درج ذیل کرتے ہیں۔ مقصد اس سے یہ بتانا [illegible]

(۱) غیر مسلم اکثریت کی محکومی میں زندگی بسر کرتے ہوئے، مسلم اقلیت کے دین کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔

(۲) اس وقت مسلمانوں کے مختلف ممالک میں قانونِ شریعت کے سلسلہ میں کس قسم کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اور

(۳) جب اسلام میں قانون سازی کا اصول نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو کس قسم کی الجھنیں پیش آتی ہیں۔ اس نقطہ کی وضاحت ہم اس روئداد کے آخر میں کریں گے۔]

(طلوعِ اسلام)

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس میں اسلامی قانون کے ماہرین بھی دنیا کے مختلف حصوں سے بہت بڑی تعداد میں آئے تھے، اس لئے اس اہم موقع پر مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کے مسئلے پر سمپوزیم کا انعقاد ضرورت اور محل کے لحاظ سے عین مناسب تھا۔ کانگریس کی مختلف کارروائیوں پر جو سرسری تبصرہ اس شمارہ

میں شائع کیا جارہا ہے اس میں مسلم پرسنل لاء پر بحث و گفتگو کا خلاصہ بھی درج ہے۔ اس خلاصے میں اگرچہ تفصیل اور وضاحت نہیں ہے، مگر اس سے مقررین اور مقالہ نگاروں کی رایوں اور ان کے رجحانات کا بہرحال بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اس بحث کے اختتام پر صدر جلسہ جناب محمد کریم چھاگلا صاحب نے بالکل صحیح فرمایا تھا کہ سوائے ایک مقرر (پروفیسر سید حسین نصر) کے سب نے اس سے اتفاق کیا کہ مسلم ممالک میں حسب ضرورت تبدیلیاں کی گئی ہیں اور ضرورت کے مطابق کی جانی چاہئیں۔

ہندوستان میں یہ مسئلہ چند ماہ قبل حکومت کے سامنے آیا تو علماء اور مذہبی اور نیم مذہبی اخبارات و رسائل کی طرف سے شدید اعتراضات کئے گئے کہ یہ مسلمانوں کا خالص مذہبی مسئلہ ہے جس میں حکومت کو اندر سے دستور مداخلت کا اختیار حاصل نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ واقعہ بھی ہے کہ سنجیدہ رسالوں اور روشن خیال علماء نے موجودہ مسلم پرسنل لاء پر نظر ثانی کی ضرورت کا اعتراف کیا اور لکھا ہے کہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری تبدیلی کرنا از بس ضروری ہے اس احساس کے زیر اثر دارالعلوم ندوۃ العلماء نے منتخب علماء کی ایک کمیٹی مقرر کی اور اس نے کافی کام کر لیا ہے، مگر ابھی زیر تکمیل ہے اس لئے اس کے متعلق کسی قسم کا اظہار خیال قبل از وقت ہوگا، مگر اخبارات و رسائل کے ذریعہ ہندوستان کے علماء کے جو افکار و خیالات سامنے آئے ہیں ان کے پیش نظر کسی بہتر تبدیلی کی امید نہیں کی جا سکتی۔ علماء دین اپنی بحثوں اور بیانوں میں سب سے زیادہ زور اس پر دیتے ہیں کہ اس معاملہ خاص میں پارلیمنٹ کو کوئی قانون بنانے یا مروجہ قوانین میں ترمیم کرنے کا کوئی اختیار نہیں، بلکہ اس کا حق صرف علمائے اسلام کو ہے۔ یہ کہتے وقت وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قانون تو بہرحال صرف پارلیمنٹ ہی بنا سکتی ہے[1] دوسرے شرعی قوانین کے لئے تجاویز مرتب کرنے کے لئے صرف دین اور سنت سے واقفیت کافی نہیں ہے، زمانے کی ضروریات و مسائل سے گہری واقفیت بھی ضروری ہے، جیسا کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب نے اس سمپوزیم میں ابو یوسفؒ کے حوالہ سے فرمایا تھا۔

ترکی اور متحدہ عرب جمہوریہ کے سفیروں نے اگرچہ اپنے مقالوں میں یہ بات پوری وضاحت سے کہی تھی کہ ان دونوں ملکوں میں مسلم پرسنل لاء میں پارلیمنٹ کے ذریعے تبدیلیاں کی گئی ہیں مگر عام طور پر

---

[1] مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے نزدیک اسلامی معاشرہ کے لئے قانون بنانے کے مجاز اولوالامر ہیں اور اولوالامر کی وضاحت موصوف نے اس طرح کی ہے: "اولوالامر سے مراد حکومت اور علماء دونوں ہیں، ایک کے پاس نفاذ کی قوت ہے اور دوسرے کے پاس وضع قانون کی اور صالح دونوں کے ملنے سے ہی ہو سکتی ہے تنہا کوئی ایک گروہ اسکو انجام نہیں دے سکتا۔" (برہان بابت ماہ اگست ۶۳ء صفحہ ۶۸)

یہ کہا جاتا ہے کہ ان ملکوں میں بھی اسلامی قوانین میں جملہ تبدیلیاں علمائے دین کے مشورہ اور ان کی رائے کے مطابق کی گئی ہیں۔ مگر یہ کہتے وقت یہ حقیقت نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ ان مسلم ملکوں کے علماء اور ہندوستان کے علماء کے خیالات اور تصورات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جن جدید افکار اور مغربی تصورات کو مصری، بغدادی اور ترکی علماء نے عرصہ ہوا قبول کر لیا ہے، ہمارے ہندوستان و پاکستان کے علماء ابھی ان کی حلت و حرمت کی بحث میں ہی الجھے ہوئے ہیں۔ ابھی حال میں ندوۃ العلماء کے ایک عربی رسالہ میں فنونِ لطیفہ کے متعلق کوئی مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کے جواب میں ازہر یونیورسٹی کے ایک جید عالم دین نے لکھا تھا کہ اس ترقی یافتہ دور میں کوئی باہوش آدمی فنونِ لطیفہ کو حرمت و حلت کی بحث کا موضوع نہیں بنا سکتا چاہے وہ ندوہ کا عالم ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارے ایک عالم دین کو یہ بات اتنی ناگوار گذری کہ علالت کے باوجود جب تک اس کی تردید میں ایک زوردار مقالہ نہیں لکھ لیا ان کو چین نہیں آیا۔ اسی سے دوسرے مسائل کے متعلق ان علمائے کرام کی رایوں اور ان کے خیالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ایک مسلم روزنامے نے زیر بحث سمپوزیم کے صدر جناب چھاگلا کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک اچھے ماہر قانون ہو سکتے ہیں، مگر ان کو مذہبی علوم میں کوئی درک نہیں ہے اس لئے وہ مسلم پرسنل لا میں کسی تبدیلی یا عدم تبدیلی کے متعلق کچھ کہنے کے مجاز نہیں ہیں۔ لیکن یہ لکھتے وقت معاصر نویس کو اس کا خیال نہیں رہا کہ ایسا ہی سوال علمائے دین سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ دینی علوم کے بیشک وہ عالم اور ماہر ہیں مگر اقتصادیات و معاشیات کے جدید اصولوں اور نظریوں بنک اور تجارت کے مغربی طریقوں، سوشلزم اور کمیونزم کے پیدا کردہ مسائل وغیرہ سے بخوبی واقف نہیں ہیں اس لئے وہ موجودہ سوسائٹی کے تقاضوں اور مطالبوں کے مطابق کوئی قانون بنانے کے اہل نہیں ہیں۔

چھاگلا صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر میں بہت معقول بات کہی تھی کہ مسلم پرسنل لا میں کچھ کا تعلق ہمارے ایمان اور عقیدے سے ہے۔ ایسے معاملات میں پارلیمنٹ کو دخل دینے کا حق نہیں، لیکن جن امور کا تعلق روزمرہ کی سماجی زندگی سے ہے۔ ان کے متعلق بہرحال عوام کے نمائندے اور پارلیمنٹ ہی بہتر فیصلہ کر سکتی ہے۔ یا مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب نے فرمایا تھا کہ دین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی، مگر شریعت زمانے اور حالات کے مطابق برابر بدلتی رہتی ہے[1] اسی طرح میر اقبال حسین

---

[1] کن احکام میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور کن میں نہیں۔ اس مسئلے پر مولانا اکبر آبادی نے برہان بابت ماہ اگست ۶۳ء کے "نظرات" میں ذرا تفصیل سے بحث کی ہے "لکھتے ہیں" یہ احکام دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن کی نسبت نصوص شرعیہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

صاحب نے محجوب الارث کے مروجہ قانون کا حوالہ دیکر فرمایا تھا کہ یہ بات کسی طرح قرین انصاف نہیں کہی جاسکتی کہ ایک شخص کے کچھ پوتے مخصوص حالت میں، وراثت سے محروم کر دیئے جائیں اور کچھ پورے ترکہ کے مالک قرار پائیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور میر اقبال حسین دونوں نے سوسائٹی کے مفاد میں ایک سے زیادہ شادی پر پابندی لگانے کو حق بجانب اور جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح کے بہت سے مسائل اور معاملات پر اسلامی ملکوں میں پارلیمنٹ کے ذریعہ پابندیاں عائد کی گئی ہیں اور حسب ضرورت کی جاتی ہیں، اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہی طریقہ ہندوستان میں بھی اختیار نہ کیا جائے۔

اس سمپوزیم میں صرف ایک تقریر ایسی تھی، جسے جذباتی کہا جاسکتا ہے۔ ایمان کے ایک پروفیسر، سید حسین نصر صاحب نے پرسنل لاء میں تبدیلی کو مغرب کی اندھی تقلید اور اس سے بیجا مرعوبیت بلکہ احساس کمتری کا نتیجہ قرار دیا۔ موصوف کے نزدیک شریعت کو دینی اور دنیاوی معاملات میں تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اسلام میں پرسنل لاء (انفرادی قانون) سرے سے موجود نہیں ہے، کیونکہ اسلام نے افراد اور معاشرہ میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ ان کے خیال میں شریعت نے کبھی زندگی کی حقیقتوں کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کیا، اس لئے تبدیلی کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ موصوف کے جذبات اور خیالات سے قطع نظر انھیں شاید اس سمپوزیم کا پس منظر اور مقصد معلوم نہ تھا یا تقریر کے وقت شدت جذبات میں یاد نہیں رہا کہ وہ بحث ہندوستان کے نئے حالات کے پیش نظر شروع کی گئی تھی، جہاں آزادی کے بعد سوسائٹی کی اصلاح و بہتری کے لئے نئے قوانین وضع ہو رہے ہیں، جہاں مسلمانوں کا

"موجود ہیں اور اس بنا پر ان کو فرض، واجب یا حرام و ناجائز کہا جاتا ہے، مثلاً محرمات نکاح و طعام، تقسیم میراث کے قوانین، انعقاد و فسخ نکاح کے شرائط و لوازم، یہ تمام احکام قطعی ہیں اور ان پر ہرگز نظر ثانی نہیں کی جاسکتی ان کے مقابلے میں دوسری قسم کے احکام وہ ہیں جن کی نسبت سرے سے کوئی نص شرعی موجود نہیں ہے یا نص موجود ہے مگر اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ وہ حکم فرض، واجب یا حرام نہیں ہے یا نص ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکم کسی خاص علت یا سبب یا حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ اس صورت میں اگر کبھی علت سبب یا حکمت و مصلحت باقی نہ رہے تو حکم خود بخود بدل جائے گا۔ خواہ وہ حکم وقتی و ہنگامی طور پر کیسا ہی لازمی اور ضروری ہو۔"

ایک پرسنل لا، پہلے سے موجود ہے، جہاں ایک سیکولر حکومت قائم ہے، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور جہاں یہ سوال ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں، دوسری سماجی اصلاحات کی طرح، تبدیلی کی جائے یا نہیں، اگر کی جائے تو کس حد تک اور اس کا طریق کار کیا ہو۔

ابھی تک اخبارات و رسائل میں مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے خلاف جتنی باتیں کہی گئی ہیں وہ زیادہ تر جذباتی اور حقیقت پسندی سے دور ہیں۔ ایسے دلائل اور بحثوں سے وقتی طور پر رکاوٹ ڈالی جا سکتی ہے، مگر مستقل طور پر نہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ علمائے دین حالات کو سمجھیں اور زیادہ بہتر ہو اگر وہ خود ہی زمانے کے "تقاضوں کے مطابق" تجاویز مرتب کر کے مسلم رائے عامہ کے سامنے پیش کر دیں۔ مولانا اکبرآبادی نے بہت ہی بروقت اور صحیح مشورہ دیا ہے کہ "علماء وقت کے تقاضوں اور ضرورتوں کا وسعتِ نظر اور روشن دماغی کے ساتھ جائزہ لیں اور ہر چیز کو مداخلت فی الدین کہنے کی عادت ترک کر دیں[1]" لیکن اگر انھوں نے یہ عادت نہ چھوڑی اور وقت کی سوئی کو روکنے کی کوشش کی تو انھیں ترکی کے انقلاب سے سبق لینا چاہیئے۔ ایک مسلم مبصر اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ مسلمان اس قدر روایت پرست واقع ہوئے ہیں کہ ترکی میں عمامے کی جگہ ترکی ٹوپی پہنانے کے لئے گولی چلانی پڑی اور جب اسی ترکی ٹوپی کو اتروا کر ہیٹ پہنایا گیا تو اس وقت بھی طاقت استعمال کی گئی۔ (اگلا صفحہ دیکھئے)

---

[1] موصوف نے علماء کے ساتھ حکمران طبقہ کو بھی مشورہ دیا ہے کہ وہ "اپنے فکر و عمل کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالے، خود شریعت کے اوامر و نواہی کا پابند ہو اور اپنی طاقت و قوت سے کام لے کر ملک کو منکرات و فواحش سے پاک و صاف کرے۔" (برہان بابت ماہ ستمبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۳۲) میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک سیکولر حکومت کا حکمران طبقہ موصوف کی اس نصیحت پر کیونکر عمل کر سکتا ہے۔

مفت مجرب دوا برائے:۔ دمہ۔ درد گردہ و پتھری۔ ملنے کا پتہ:۔
حاجی محمد دین شیخ آئس فیکٹری۔ متصل گنیش کھوپرا ملز لارنس روڈ کراچی / نوٹ:۔ جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے

طلوع اسلام

اسلامی نقطہ نگاہ سے قانون سازی کی بحث میں سب سے بڑی دقت اس لئے پیش آتی ہے کہ یہ بات ذہنوں میں صاف نہیں ہوتی کہ اسلامی قوانین میں سے کون کون سے ایسے ہیں جن میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا اور کون سے ایسے ہیں جو قابل تغیر ہیں۔ مولانا سعید اکبر آبادی نے جو کہا ہے کہ احکام دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کی نسبت نصوص شرعیہ" موجود ہیں اور اس بنا پر انہیں فرض و واجب یا حرام و ناجائز کہا جاتا ہے ..... دوسری قسم کے وہ احکام ہیں جن کی نسبت سرے سے کوئی نص شرعی موجود نہیں۔ یا نص موجود ہے مگر اس میں اس بات کی صراحت ہے (؟) کہ وہ حکم فرض واجب یا حرام نہیں یا نص ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکم کسی خاص علت یا سبب، حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ اس صورت میں اگر کبھی علت، سبب یا حکمت و مصلحت باقی نہ رہے تو حکم خود بخود بدل جائے گا خواہ وہ حکم دقتی و ہنگامی طور پر کیسا ہی لازمی اور ضروری ہو" اس ضمن میں سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "نصوص شرعیہ" کسے کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہزار سال سے یہ مسئلہ زیر بحث چلا آرہا ہے اور مسلمانوں کے مختلف فرقے اسی مسئلہ کے اختلاف پر مبنی ہیں۔

اصول صاف اور سیدھا یہ ہے کہ جو احکام و قوانین قرآن کریم میں آئے ہیں وہ غیر متبدل ہیں۔ جن احکام و قوانین کو اس نے اصولی طور پر بیان کیا ہے اور ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں وہ جزئیات اسلامی حکومت امت کے مشورے سے مرتب کرے گی۔ اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ جو احکام غیر متبدل ہیں" وقتی مصالح کے مطابق ان کا لفاظ ملتوی کیا جا سکتا ہے۔ (جیسے خلافت راشدہ میں اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کی اجازت روک دی گئی تھی۔ اسے اب بھی روک دینا چاہیئے)۔ قرآن کی رو سے پرسنل لاء اور پبلک لاء کی تفریق نہیں۔

طلوع اسلام کنونشن کی پختہ تاریخوں کے متعلق بعد میں اعلان کیا جائے گا۔

کیا خُدا عادل ہے

ویل پور سے ایک صاحب نے ہمیں ایک سوال بھیجا جس کا موضوع یہ تھا کہ "کیا خدا عادل ہے"۔ ہم نے انہیں لکھا کہ یہ سوال ایسا نہیں جس کا جواب ایک خط میں دیا جا سکے۔ اس اہم اور بنیادی سوال کے سمجھنے کے لئے نظام کائنات۔ قانونِ مکافاتِ عمل۔ انسانی اختیار و ارادہ۔ انسانی دنیا میں خدا کا طریق کار۔ فرد اور معاشرہ کے تعلقات۔ ظالم کے ظلم میں خود "مظلوموں" کا حصہ وغیرہ جیسوں گوشے سامنے آئیں گے جو بڑی تفصیل چاہتے ہیں۔ اس لئے اس سوال کو زبانی گفتگو سے سمجھنا زیادہ آسان ہوگا۔ لیکن ان کا اصرار ہے کہ ان کے سوال کا جواب لکھ کر ہی دیا جائے اور اسے طلوع اسلام میں شائع کیا جائے۔ ہم شروع ہی میں اس امر کا اعتراف یا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے اس جواب میں بھی وہ تمام متعلقہ گوشے تفصیلاً سامنے نہیں آسکتے جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ جواب بہر حال مختصر ہوگا اور صرف اصولی حیثیت لئے ہوئے۔ آپ پہلے ان کا سوال ملاحظہ فرمائیے۔

سوال۔

میں دیکھتا ہوں کہ اسلام کا خدا عادل کے نام سے مشہور ہے لیکن اس کے باوجود میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ وہ کیسا عادل خدا ہے، جو اس دنیا میں ایک غریب آدمی کو ساری عمر تڑپتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے لیکن اس میں کبھی اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اس غریب کے آنسوؤں کو خشک کر سکے۔ اس کے درد کی دوا بن سکے۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس غریب کی زندگی میں المیہ پر المیہ ٹوٹتے ہیں، لگاتار حادثات اس کی کمر توڑتے رہتے ہیں۔ مزید برآں وہ آدمی ہوتا بھی نیک ہے، خدا کے قرآن کو سینے سے لگائے رکھتا ہے، ساری دنیا گواہی دیتی ہے کہ اس جیسے نیک طینت آدمی بار بار پیدا نہیں ہوتے، لیکن اس کے باوجود وہ ظلم و ستم کا شکار رہتا ہے، اس کے برعکس ایک امیر آدمی فسق و فجور کی زندگی بسر کرتا ہے، دولت اس کے قدموں کو بوسہ دیتی ہے، دنیا کی تمام آسائشیں اس کو ہدیۂ تبریک پیش کرتی ہیں۔ اس طرح بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ رشوت خور کو اس دنیا میں پوری سزا مل ہی جائے۔ ایک چور بعض اوقات

تو قانون کی نظر میں چور ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات قانون کو اس کی چوری کا علم ہی نہیں ہوتا۔ ایک ایٹمن ۹۰ لاکھ جانیں تلف کرنے کے بعد قانون کی نظر میں صرف پھانسی کا مستحق ہوتا ہے ۔ دیکھئے اس سوال کو حل کرنے میں بعض علماء کرام آخرت کے جواز میں دلیل نکالتے ہیں، جو میرے نظریہ کے خلاف ہے میں صرف خدا کو مانتا ہوں۔ آخرت کے متعلق میرا یقین ابھی شک کی دہلیز پر ہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایک عادل خدا اگر صرف آخرت میں ہی عدل کر سکتا ہے اور اس دنیا میں بالکل خاموشی سادھے ہوئے ہے تو کیا یقین کہ آخرت میں بھی وہ عدل کر سکے یا نہ ۔۔۔ اس لئے میرا سوال یہ ہے کہ خدا عادل ہے تو اتنا ظلم کیوں ؟ اگر نہیں تو اس قسم کے خدا پر جو عدل نہیں کر سکتا، کون یقین کرے ۔ ؟

جواب ۔

سوال کے آخری حصہ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ۔ فلسفۂ اخلاق میں یہ "معمہ" بہت قدیم اور مشہور ہے کہ اگر شر، خدا کی مرضی سے موجود ہے تو خدا خیر نہیں ہو سکتا ۔ اور اگر وہ خدا کی مرضی کے خلاف موجود ہے تو خدا قادر مطلق نہیں ہو سکتا ۔ لفظی طور پر یہ معمہ بڑا مشکل نظر آتا ہے لیکن جب اسے قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے تو بڑا آسان ہو جاتا ہے ۔ یہ بات محض ضمناً سامنے آگئی ۔ ہمارے زیر نظر سوال کا تعلق عدل سے ہے ۔

۲۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا نے اپنے لئے (قرآن میں) عادل کا لفظ استعمال نہیں کیا ۔ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے کائنات کے نظم و نسق کے لئے (جس میں انسانی دنیا بھی شامل ہے) کچھ قوانین مقرر کر دیئے ہیں اور ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی ۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ۔ لہٰذا یہاں ہر بات قانون کے مطابق عمل میں آتی ہے ۔ اور اگر عدل کی تعریف یہ ہے کہ جو بات قانون کے مطابق ہو اسے عدل کہا جاتا ہے، تو اس اعتبار سے آپ خدا کو عادل کہہ سکتے ہیں ۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ وہ کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا ۔ لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں ۔ اور یہ بھی کہ ظلم پر مبنی نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا ۔

۳۔ ہمارے مستفسر کے ذہن میں خدا کے عادل ہونے کا تصور یہ ہے کہ جونہی کوئی شخص جھوٹ بولے اس کی زبان گنگ ہو جائے ۔ جونہی کوئی کسی کی طرف نظر بد سے دیکھے تو اس کی آنکھ پھوٹ جائے ۔ جونہی کوئی ظالم کسی کمزور کے خلاف ہاتھ اٹھائے تو اس کا بازو پتھر کا بن جائے ۔۔۔ اگر ایسا ہو تو پھر خدا کو عادل مانا جائے ۔ اور اگر ایسا نہ ہو (جیسا کہ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا) تو پھر خدا عادل کس طرح کہا سکتا ہے ۔ یعنی اگر خدا ہمارے تصور کے مطابق عادل ہو تو اسے عادل کہا جائے ۔ اور اگر وہ عدل کے اس تصور پر پورا نہ اترے تو اسے عادل کیسے مانا جائے !

خدا نے انسان کو اختیار و ارادہ دیا ہے اور یہی اس کا مابہ الامتیاز شرف ہے ۔ اسی سے وہ اپنے اعمال

کے نتائج کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ نیکی وہی نیکی ہے جسے انسان اپنے اختیار سے عمل میں لائے۔ انسان کی عظمت اس میں ہے کہ وہ بدی کی استعداد و استطاعت رکھتا ہوا بدی سے مجتنب رہے۔ ہم پتھر کو نیک نہیں کہہ سکتے حالانکہ وہ ساری عمر کوئی برائی نہیں کرتا۔ ہم بکری کی شان میں کبھی قصیدۂ مدحیہ نہیں پڑھتے کہ اس نے ساری عمر کسی کا خون نہیں پیا۔ نہ مجبور کی نیکی نیکی ہے۔ نہ اس کی بدی بدی۔ سعدیؒ کے الفاظ ہیں۔

تواضع زگردن فرازاں نکوست گدا گر تواضع کند خوئے اوست

جس میں سر اٹھا کر چلنے کی استطاعت ہی نہیں اس کی انکساری اور خاکساری کبھی وجہِ تحسین نہیں ہوسکتی۔ اختیار و ارادہ کی قوت کے صحیح استعمال ہی سے انسان کی صلاحیتوں کی بردمندی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے انسان کو اختیار و ارادہ دیا ہے تو وہ اسے کبھی سلب نہیں کرتا۔ خدا نے اپنے قادرِ مطلق ہونے کے باوجود اپنے آپ پر خود یہ پابندی عائد کر رکھی ہے۔ اور یہ اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ ورنہ کوئی تنگ ظرف ہو تو اسے بات بات پر غصہ آجائے اور انسان کے اختیار کو جھٹ سلب کرکے اسے اپنی مرضی کے مطابق چلنے پر مجبور کردے۔ ہمارے متصوفین نے خدا کے داخل ہونے کا جو تصور پیش کیا ہے اس سے خدا کا نقشہ اسی قسم کا سامنے آتا ہے۔ یعنی خدا کو چاہیئے کہ وہ انسانوں کے معاملات میں انفرادی طور پر دخل دے اور جونہی کوئی بات اس کے منشاء کے خلاف ہونے لگے اسے اپنی قوت کے زور سے فوراً روک دے۔ آپ سوچئے کہ اگر خدا نے یہی کچھ کرنا ہوتا تو اسے اسقدر طولِ عمل کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ انسانوں کو ڈیڈ بیٹر یکس کی طرح ، پیدا ہی اس طرح کرتا کہ ان میں غلط راستے پر چلنے کی استطاعت ہی نہ ہوتی۔ لیکن ذرا سوچئے کہ اس سے انسانی دنیا کا نقشہ کیسا ہوتا؟ یہ صاحبِ عقل و شعور اور ذی اختیار و ارادہ انسانوں کی حلیتی پھرتی زندہ اور متحرک دنیا نہ ہوتی بلکہ سنگ و خشت اور دام و دد کی دنیا ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ اگر ہم چاہتے تو انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کرتے کہ وہ ایک روش پر چلنے کے لئے مجبور ہوتے۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ انسان کو اس انداز سے پیدا کیا ہے کہ وَلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ جس کا جی چاہے اپنے اختیار و ارادے سے سیدھے راستے پر چلے اور جس کا جی چاہے غلط راستہ اختیار کرلے۔ اور یہ اس لئے کہ وَلَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶/۹۳) تاکہ ہر ایک پر اس کے کام کی ذمہ داری عائد ہو۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہو کہ جو شخص غلط قدم اٹھانے کا ارادہ کرے اس کا قدم ہی نہ اٹھ سکے، تو انسان کے صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کا مقصد ہی فوت ہو جائے اور وہ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مجبوراً صحیح روش پر چلے۔ اس باب میں (کہ کسی کو جبراً صحیح روش پہ نہ چلایا جائے) اس قدر احتیاط برتی گئی ہے کہ مخالفین رسول اللہؐ سے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور خدا اس سے یہ کہہ کر انکار کر دیتا تھا کہ معجزہ دکھانے سے ذہنی جبر (MENTAL COMPULSION)

کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس قسم کا اقرار انسان کی آزادیٔ فکر (FREEDOM) کا نتیجہ نہیں ہوتا اس لئے معجزہ دکھا کر مسلمان بنانا خدا کی اسکیم کے خلاف جاتا ہے۔ چہ جائیکہ کہ ظالم کے ہاتھ کو مافوق الفطرت قوت سے روک کر اسے ظلم سے باز رکھنا۔

۳۔ اب یہ دیکھئے کہ ظلم ہوتا کس طرح سے ہے اور انسانی معاشرہ میں خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل پیرا کس طرح ہوتا ہے۔ اگر معاشرہ کا نظام صحیح خطوط پر متشکل ہو تو اس میں کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا۔ اگر کہیں انفرادی طور پر کوئی شخص کسی پر دراز دستی کر ہی بیٹھے تو معاشرہ کا نظام اس کا فوری مواخذہ اور تدارک کر دیتا ہے۔ ظلم ہوتا ہی اس معاشرہ میں ہے جو غلط بنیادوں پر استوار ہو۔ لہٰذا سوال کسی فرد (ظالم) کے مواخذہ کا نہیں۔ اس غلط معاشرہ کے مواخذہ کا ہے جس میں ظلم روا رکھا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر اس حقیقت کو واشگاف کیا ہے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو نظام ظلم پر مبنی ہوگا وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا خواہ نظم و نسق کی لاکھ تدبیریں اس کے استحکام کے لئے کوشاں کیوں نہ ہوں۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ جو نظام مادی قوتوں کو اکٹھا کرے۔ اپنی حفاظت کے اسباب و ذرائع کو مستحکم کرے۔ اپنے نظم و نسق کو نہایت حسنِ تدبر سے چلائے وہ نظام کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتا، لیکن خدا کا کہنا یہ ہے کہ یہ غلط ہے۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ ایسا معاشرہ تباہ ہو کر رہتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں خدا کا عدل سامنے آتا ہے۔ قرآن کریم نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں تاریخ عالم کے متعدد شواہد پیش کئے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ قومیں قوت، دولت، شان و شوکت۔ سامانِ زیست۔ کثرتِ تعداد۔ ذرائع پیداوار وغیرہ کے اعتبار سے بڑی ممتاز تھیں لیکن چونکہ ان کا نظام ظلم پر مبنی تھا اس لئے ان کی دولت و قوت اور حسنِ تدبیر انہیں تباہی سے نہ بچا سکے۔ حتیٰ کہ ان کا علم و بصیرت بھی ان کے کسی کام نہ آیا وہ خدا کے قانون مکافات کو بے بس نہ کر سکے۔ وہ قومیں تباہ ہو کر رہیں۔

۴۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک اور حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں لوگوں کو دھوکا لگ جاتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا عدل کوئی شے نہیں۔ نہ ہی اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کی کوئی ہستی ہے۔ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ ہر عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس طور پر سامنے آنے میں ایک وقفہ ہوتا ہے جس طرح تخم ریزی اور فصل کے پکنے میں ایک مدت درکار ہوتی ہے۔ اسے خدا کا قانون تدریج کہا جاتا ہے۔ یعنی قوموں کا تدریج۔ آہستہ آہستہ تباہی کی طرف بڑھتے چلے جانا۔ یہ مہلت کا وقفہ بھی خدا کے قانون کے مطابق متعین ہوتا ہے۔ اگر اس قوم کی صلاحیتوں کا پلڑا بھاری ہے اور کمزوریاں اور لغزشیں کم ہیں تو یہ وقفہ لمبا ہو جاتا ہے۔ قوم ڈوبتی اسوقت ہے جب اس کی کمزوریاں اس کی صلاحیتوں پر غالب آجاتی ہیں۔ یہاں کمزوریوں اور صلاحیتوں سے مراد ہے غلط روش اور صحیح روشِ زندگی۔ چونکہ قوموں کی زندگی دنوں اور مہینوں سے نہیں ماپی جاتی۔ وہ صدیوں کے

حساب سے ماپی جاتی ہے۔ اس لئے یہ مہلت کا وقفہ بھی بعض اوقات سینکڑوں برس تک پھیل جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار برس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک فرد کی مدت العمر میں یہ وقفہ پورا نہیں ہو سکتا، اور یہی وجہ ہے کہ انسان اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ سب دعوے یونہی باتیں ہی باتیں ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں کہ ظالم اور جابر پنپتے چلے جاتے ہیں اور مظلوم و مقہور بیچارے پستے چلے جاتے ہیں۔ اگر خدا عادل ہوتا۔ یا اس کا قانون مکافات حقیقت ہوتا تو ظالم تباہ نہ ہو جاتے؟

۵۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ مہلت کا عرصہ سکڑ کر کم بھی ہو سکتا ہے یا اتنے کا اتنا ہی طول طویل رہتا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ کم ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر انسانوں کی کوئی جماعت ایسی پیدا ہو جائے جو خدا کے قانون کے مطابق معاشرہ قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرے تو اس کے ہاتھوں ظلم و استبداد پر مبنی نظام کا خاتمہ دنوں میں ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر انسان کا دست و بازو قانونِ خداوندی کا رفیق و دمساز بن جائے تو پھر صدیوں کے کام دنوں میں سرانجام پا جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ انسانی دنیا میں خدا کا قانون انسانوں کے حساب و شمار سے، انسانوں کے ہاتھوں نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ اور اس طرح وہ مہلت کا وقفہ جس کے بعد غلط نظام سے تباہ ہوتا تھا، صدیوں کے بجائے دنوں میں بدل جاتا ہے۔

ہمارے مستفسر نے کہا ہے کہ ایک شخص بڑا نیک ہے۔ وہ قرآن کو سینے سے لگائے رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس پر ظلم پر ظلم ہوتے رہتے ہیں۔ اس مقام پر ہمارے محترم مستفسر پھر ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ اس شخص کے نیک ہونے سے غالباً ان کی مراد یہ ہے کہ وہ نماز روزے کا پابند ہے۔ صدقہ خیرات بھی کرتا ہے۔ اس کے عام اخلاق بھی اچھے ہیں۔ لیکن قرآن کی میزان میں نیکی اسی کو نہیں کہتے۔ اس کے نزدیک "نیک" وہ ہے جو غلط نظام کے الٹنے اور اس کی جگہ صحیح نظام خداوندی قائم کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور یہ کام انفرادی طور پر نہیں ہو سکتا اس لئے یہ شخص اس جماعت کا فرد بنکر جدوجہد کرتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یعنی وہ جماعت جو غلط نظام کی جگہ صحیح نظام خداوندی قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ قرآن کی رو سے زندگی ہے ہی اجتماعی۔ اگر وہ شخص جو ہمارے مستفسر کے تصور کے مطابق بڑا نیک ہے اور قرآن کو سینے سے لگائے پھرتا ہے، لیکن ظلم پر مبنی نظام کے اندر خاموش زندگی بسر کئے جاتا۔ بلکہ ظلم پر ظلم سہے جاتا ہے اور اس کے خلاف کچھ نہیں کرتا (بجز آہ و فغاں کے) تو وہ شخص نہ صرف یہ کہ نیک ہی نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ وہ اس ظالم نظام کی تقویت کا (بالواسطہ) موجب بننے کے وجہ سے، عدالت خداوندی میں ظلم کی اعانت کا مجرم بھی قرار پاتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے اپنے تمثیلی انداز میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب جہنم میں تباہ ہونے والی قوم کے لیڈر اور ان کے متبعین جمع

ہوں گے تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو الزام دیں گے کہ ہماری تباہی کا موجب تم ہو۔ ظاہر ہے کہ ان لیڈروں کے جرائم تو نمایاں طور پر سامنے ہونگے لیکن یہ متبعین وہ ہونگے جن کی ساری عمر ظلم سہتے سہتے گذری تھی۔ جب یہ اپنے لیڈروں کو مورد الزام قرار دیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ اس باب میں تم بھی کچھ کم مجرم نہیں ہو۔ ان لیڈروں کی طاقت کا ذریعہ تم ہی تھے۔ تمہارے بل بوتے پر یہ اس قدر بدمست اور سرکش ہو رہے تھے۔ اگر تم ان کے مظالم برداشت کرتے چلے جانے کے بجائے، ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تو انہیں ان دراز دستیوں کی ہمت ہی نہ پڑتی۔ اس لئے ان کے مظالم میں تم بھی برابر کے شریک ہو۔ یہ وجہ ہے کہ ان کے ساتھ تم بھی جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو۔ اس لئے جن مظلوم کو دیکھ کر ہم خون کے آنسو بہاتے ہیں، وہ بھی درحقیقت بالواسطہ اس باطل نظام کا پرزہ ہوتا ہے۔

۷۔ تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قوموں کی موت و حیات کے فیصلے قانونِ خداوندی کی رُو سے ہوتے ہیں۔ اور اسی کا نام خدا کا عادل ہونا ہے۔ اس کا قانون یہ ہے کہ انہ لا یفلح الظالمون۔ جو نظام ظلم پر مبنی ہوگا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ دوسری طرف و یمکث فی الارض ما ینفع الناس۔ بقا اس نظام کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ یہی اچھے اور بُرے نظام کا معیار ہے اور اسی معیار کے مطابق کسی نظام کی فنا اور بقا کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر خدا کے اس قانون کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر معیار صرف یہ رہ جائے گا کہ جس نظام کی پشت پر مادی قوت زیادہ ہو وہ کامیاب و کامران ہو خواہ وہ کتنا ہی ظلم و استبداد پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اور جس کے پاس نسبتاً کم طاقت ہو وہ تباہ ہو جائے خواہ وہ نوعِ انسان کے لئے کیسا ہی منفعت بخش کیوں نہ ہو۔ یعنی معیارِ صرف مادی قوت قرار پا جائے۔ اس بات کا اس پر کچھ اثر نہ ہو کہ خود وہ نظام کیسا ہے قوموں کی تاریخ اور مورخین تہذیب کی تحقیقات اس نظریہ کی تغلیط کرتی ہیں۔ اور اس قانون کو صحیح قرار دیتی ہیں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ایک اچھے نظام کی حفاظت کے لئے بھی مادی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس نظام کی بنیادی اچھائی بھی ایک قوت اپنے اندر رکھتی ہے۔ جو اسے تباہ ہونے سے محفوظ رہنے میں بڑی مدد دیتی ہے

یہ ہے خدا کا "نظام عدل"

"پاکستان کا مستقبل" بقیہ صفحہ ۵۰

جس کی خوشگواریاں اقوام عالم کو یہ باور کرا سکیں کہ یہی ہے وہ نظام خداوندی جو نوعِ انسانی کو موجودہ جہنم سے نجات دلا کر اسے ایک بار پھر وہ جنت ارضی عطا کر سکتا ہے جو چودہ سو برس قبل حضور نبی اکرم والذین معہٗ کے مبارک ہاتھوں وجود پذیر ہوئی تھی۔

بابُ المراسلات

زمانے کے تقاضے

ایک صاحب لاہور سے دریافت کرتے ہیں کہ آج کل عام طور پر یہ بات سُننے میں آتی ہے۔ اور طلوع اسلام خود بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ اسلام زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ ہمیں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ لیکن زمانے کے تقاضے تو آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ کیا ان کے ساتھ اسلام بھی آئے دن بدلتا جائے گا۔ مثلاً۔ آج کل زمانے کا تقاضا ہے کہ عورتیں نیم عریاں لباس پہنتی ہیں۔ کلبوں میں جاکر ناچتی ہیں۔ جیم خانوں میں شراب کا دور چلتا ہے۔ کیا اسلام کو ان چیزوں کا ساتھ دینا ہوگا؟ اگر اسلام ایسا نہیں کریگا تو وہ زمانے کے تقاضوں کا ساتھ کس طرح دیگا!

طلوع اسلام

جس غلط فہمی میں ہمارے یہ مستفسر مبتلا ہیں اس میں آجکل بہت سے لوگوں کو مبتلا پایا گیا ہے (درحقیقت ہمارے ہاں ایک رَو پیدا کی گئی ہے جس سے اس قسم کی غلط فہمیاں دانستہ پھیلائی جاتی ہیں ورنہ بات کچھ ایسی مشکل یا الجھاؤ کی نہیں) پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ ایک چیز ہے کسی معاشرہ کی روش اور دوسری چیز ہے زمانے کا تقاضا۔ جو مثال ہمارے مستفسر نے پیش کی ہے وہ معاشرہ کی روش ہے۔ زمانے کا تقاضا نہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے ہمیں ان دونوں باتوں کا فرق ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اب آیئے اسلام کی طرف۔

قرآن کریم نے بعض احکام دیئے ہیں اور بعض اصول۔ اس کے احکام ہوں یا اصول وہ سب غیر متبدل ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اگر کسی معاشرہ کی روش ان کے خلاف جاتی ہے تو ہمیں اس روش میں تبدیلی کرنی ہوگی نہ کہ قرآن کے احکام و اصول میں تبدیلی۔

جہاں تک قرآن کے اصولوں کا تعلق ہے انہیں عملی شکل دینے کے لئے فقہی قوانین مرتب کئے جاتے ہیں۔ یہ قوانین

اُس زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھ کر مرتب کئے جاتے ہیں جن میں ان اصولوں کو عملاً نافذ کرنا مقصود ہو۔ اگر وہ حالات باقی نہ رہیں تو ان فقہی قوانین میں بھی تبدیلی کی جائے گی تاکہ نئے قوانین بدلتے ہوئے حالات کے مطابق عمل پذیر ہو سکیں۔ اس کو "زمانے کا تقاضا" کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنے اپنے زمانے کے حالات۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے زمانے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے تو اس سے مطلب یہ ہے کہ قرآن کے اصولوں کی روشنی میں جو فقہی قوانین کسی گذشتہ زمانے میں مرتب ہوئے تھے اگر ہمارے زمانے کے حالات بدل گئے ہیں تو ہمیں ان قوانین میں بھی مناسب ردوبدل کر لینا چاہیئے۔ ان جزئی قوانین میں اس قسم کا ردوبدل، اسلام کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔ مثلاً نبی اکرمؐ کے زمانے میں بعض لوگوں کو مملکت کی طرف سے کچھ مالی امداد دی گئی تھی۔ انہیں مؤلفۃ القلوب کہا جاتا ہے جس کا ذکر خود قرآن میں ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس امداد کو یہ کہہ کر بند کر دیا کہ جن حالات میں وہ امداد دی گئی تھی وہ اب باقی نہیں رہے لہٰذا اس قانون میں تبدیلی کر دی گئی ہے اسی طرح نبی اکرمؐ اور عہد صدیقیؓ میں قانون یہ تھا کہ مفتوحہ زمینیں سپاہیوں کو تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب عراق کا وسیع زرعی رقبہ مملکت کے ہاتھ آیا تو حضرت عمرؓ نے سابقہ قانون پر از سر نو غور کیا اور بدلے ہوئے حالات کے مطابق اسے بدل دیا۔ وہ زمینیں سپاہیوں میں تقسیم کرنے کے بجائے مملکت کی تحویل میں لے لی گئیں۔ اسی طرح عہد صدیقیؓ تک قاعدہ یہ تھا کہ مملکت کی جسقدر نقد آمدنی ہوتی اسے ساتھ کے ساتھ تقسیم کر دیا جاتا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک طرف یہ آمدنی بہت بڑھ گئی۔ دوسری طرف مملکت کی مستقل ضروریات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ ان بدلے ہوئے حالات کے ماتحت آپ نے سابقہ قاعدہ کو بدل دیا اور اس آمدنی کو بیت المال میں داخل کر کے باقاعدہ حساب کتاب کا محکمہ (دیوان) کھول دیا۔ اس قبیل کی اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ہمارے عدول از قرآن، قوانین شریعت اُس زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھ کر مدون کئے گئے تھے۔ جس زمانے میں وہ مرتب ہوئے تھے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان قوانین کا از سر نو جائزہ لیں اور حالات کی تبدیلی سے جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہو ان میں مناسب تبدیلی کر لی جائے یہ ہے مطلب "زمانے کے تقاضوں" یا "بدلے ہوئے حالات" کا ساتھ دینے کا۔ نہ یہ کہ جس چیز کو خدا نے ناجائز قرار دیا ہے اسے جائز قرار دے دیا جائے۔ اس قسم کا اختیار کسی فرد۔ معاشرہ یا حکومت کو حاصل نہیں۔ جس طرح ہمیں مروجہ قوانین شریعت کا جائزہ لینا چاہیئے۔ اسی طرح آجکل کی معاشرتی روشوں کا بھی محاسبہ کرنا چاہیئے۔ ان میں سے جو روش بھی قرآن کے کسی حکم یا اصول کے خلاف ہو اسے بدل دینا چاہیئے۔

پھر سن لیجئے کہ دین، قوانین یا اصولوں کی حیثیت سے، قرآن کریم کے اندر مکمل ہو چکا ہے۔ جو کچھ قرآن میں ہے وہ غیر متبدل ہے۔ قرآنی اصولوں کی روشنی میں جو جزئی قوانین مرتب ہونگے اور ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو طریقے اختیار کئے جائیں گے وہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بدلے جا سکیں گے۔ ذالک الدین القیم

۲۔ عالم کسے کہتے ہیں

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ طلوع اسلام کے لٹریچر میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے علمائے کرام، علم سے بے بہرہ ہیں، یہ حضرات اپنے آپ کو عالم کہتے ہیں۔ اتنے سال تحصیل علم کے لئے صرف کرتے ہیں۔ اگر یہ علم سے بہرہ ہوتے ہیں تو پھر علم کسے کہا جائیگا

طلوع اسلام

ہم اپنے مستفسر سے یہ عرض کریں گے کہ وہ اس بات پر غور کرکے خود ہی جواب دیں کہ اگر ایک شخص قرآن کریم کو حفظ کرلے تو کیا آپ اسے قرآن کا عالم کہیں گے؟ آپ اسے قرآن کا عالم کبھی نہیں کہیں گے حالانکہ اسے سارا قرآن حفظ یاد ہے۔ یہ اس لئے کہ اس نے قرآن کریم کے الفاظ یاد کئے ہیں۔ ان پر غور و فکر نہیں کیا۔ عقل و بصیرت سے کام لے کر اس کے مطالب معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یاد رکھئے۔ کسی چیز کے حفظ کرنے میں عقل و فکر کو کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اس لئے محفوظ کرنے کو علم نہیں کہا جا سکتا۔

ہمارے علمائے کرام کی بعینہٖ یہی حالت ہے۔ انہوں نے قدیم زمانہ کی کتابوں کو اس طرح حفظ کیا ہوتا ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں مسئلہ کے متعلق فلاں کتاب میں کیا لکھا ہے، فلاں امام نے کیا کہا ہے، فلاں مفسر کا کیا قول ہے۔ فلاں محدث کا کیا ارشاد ہے۔ جو کچھ انہیں ان کتابوں میں لکھا ملتا ہے وہ اسے حرفاً حرفاً نقل کر دیتے ہیں اس میں اپنی عقل و فکر کو قطعاً دخل نہیں دینے دیتے۔ انہیں اس کی اجازت ہی نہیں ہوتی۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ اب ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں "معلومات" (INFORMATION) حاصل ہوتی ہیں لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا علم بہت ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے علم کی تعریف خود بیان کر دی ہے۔ جب کہا کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ اس کے بعد ہے اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶)۔ یاد رکھو تمہارے سمع۔ بصر۔ اور قلب (فؤاد) ہر ایک سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ لہٰذا قرآن کی رو سے "علم" وہ ہے جس میں سننے اور دیکھنے کے علاوہ انسان کی فکری صلاحیتوں (فؤاد — MIND) کا بھی دخل ہو۔ جو معلومات محض سمع، بصر پر مبنی ہوں اور ان میں انسان کے اپنے فہم و تدبر کا دخل نہ ہو، وہ علم کی تعریف میں نہیں آتیں۔ ہمارے علمائے کرام کا سارا "علم" سمع و بصر پر موقوف ہوتا ہے یعنی یا کتابیں رٹ لینا اور یا استاد کی سنائی ہوئی باتوں کو محفوظ کر لینا (خواہ حافظہ کی مدد سے یا تحریر کے ذریعے)۔ ان کی فکری صلاحیتوں کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا — اس لئے کہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، انہیں اس کی اجازت ہی نہیں کہ جو کچھ چلا آرہا ہے اس میں عقل و فکر کو دخل دے سکیں۔ یہ ان کے نزدیک بدعت اور اتحاد ہے۔ ان ہی سب سے تما عالم وہ

ہوگا جو سب سے زیادہ حوالے دے سکے۔ ہم اسی لئے انہیں عالم کے بجائے (CATALOGUER) کہا کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے انہی کے متعلق کہا تھا کہ

فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

قرآن نے اس کو "حمل اسفار" (۶۲/۵) کہتا ہیں اٹھائے پھرنے سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اپنے محدود سے دائرے میں معلومات کے حافظ ہوتے ہیں۔ عالم نہیں ہوتے۔ جن لوگوں کے مسلک میں عقل و فکر سے کام لینا حرام ہو وہ عالم ہو کیسے سکتے ہیں؟ ان سے کسی مسئلہ کے متعلق پوچھئے۔ یہ بیس اسناد گنا دیں گے اور درجنوں حوالے پیش کر دیں گے۔ لیکن ان سے اگر یہ پوچھئے کہ ایسا کیوں کرنا چاہیئے تو اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا بجز کفر کے فتوے کے۔ کیا علم اسی کو کہتے ہیں۔

۳۔ اسلامک سوشلزم

ایک صاحب کہتے ہیں "طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں آپ نے اسلامک نیشنلزم کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے بہت سے شبہات رفع ہوگئے۔ اس سے درحقیقت مراد یہ ہے کہ مسلم نیشن ایمان کے اشتراک سے وجود میں آتی ہے اور نسل۔ رنگ۔ وطن کی تفریق مسلمانوں کے اُمتِ واحدہ ہونے کے راستے میں حائل نہیں ہوتی۔ اسی سلسلہ کی ایک اصطلاح "اسلامک سوشلزم" ہے۔ اخبارات میں شائع شدہ خبروں کے مطابق صدر مملکت محمد ایوب خاں نے تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے مقدمہ میں اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ

> معاشی اور معاشرتی دائروں میں ہمارے پیش نظر منتہیٰ یہ ہے کہ ہم بتدریج پاکستان میں اسلامک سوشلزم قائم کر دیں۔ اسلامک سوشلزم کی اصطلاح رفاہی مملکت (WELFARE STATE) کی اصطلاح کے قریب قریب مرادف ہے اس فرق کے ساتھ کہ رفاہی مملکت کے نصب العین کے علاوہ اسلامک سوشلزم اس بات کا بھی خیال رکھے گی کہ ملک کا کلچرل اور مذہبی ورثہ محفوظ رہے اور وہ معاشی ترقی کے اشتراکی جذبہ کی پھینٹ نہ چڑھ جائے لہٰذا اسلامک سوشلزم کا تصور، رفاہی مملکت کے تصور سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور ایک فرد کی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ (پاکستان ٹائمز ۳۰/۶/۶۴)

اس سے واضح ہے کہ پاکستان میں معاشی ترقی کا منتہیٰ مغربی ممالک کی رفاہی مملکت نہیں بلکہ دین کی اقدار کا تحفظ بھی اسی کے اندر آجاتا ہے۔ یہ تشریح اطمینان بخش ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں ان اصطلاحات کی بجائے

اپنی اصطلاحات کیوں نہ استعمال کیا کریں۔ یہ ظاہر ہے کہ نیشنلزم، سوشلزم، رفاہی مملکت کی اصطلاحات عصرِ حاضر میں ایک خاص مفہوم کی حامل ہیں۔ اول الذکر دونوں اصطلاحات اسلام کے بنیادی اصولوں کی نقیض ہیں اور تیسری اصطلاح اتنی ناقص ہے کہ اسے اسلامی رنگ دینے کے لئے مزید اضافہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم مسلم نیشنلزم کی جگہ اُمتِ مسلمہ (یا ملتِ اسلامیہ) کی اصطلاح استعمال کریں اور اپنے معاشی پروگرام کے متعلق "اسلام کے معاشی نظام" کی اصطلاح سے تعبیر کریں، تو یہ اصطلاحات جامع بھی ہوں گی اور اپنے مقصد و منتہیٰ کی روح سے واضح بھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ طلوعِ اسلام میں اس سے پہلے ان امور کے متعلق کچھ لکھا بھی گیا تھا۔ لیکن اگر ان کی پھر وضاحت ہو جائے تو اچھا ہے۔

طلوعِ اسلام

آپ کو ٹھیک یاد پڑتا ہے۔ طلوعِ اسلام ان موضوعات پر ایک بار نہیں بلکہ متعدد بار لکھ چکا ہے۔ بلکہ لکھتا چلا آرہا ہے۔ قرآن کریم نے ہمیں ایک نظامِ زندگی دیا ہے اور اس نظام کی تعبیر کے لئے اس کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ نہ یہ اصطلاحات کسی اور نظام پر فٹ بیٹھتی ہیں اور نہ ہی کوئی دوسری اصطلاح اس نظام کے متعلقہ گوشہ کی صحیح تعبیر کر سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر نظام کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں اور وہی اصطلاحات اس نظام کی صحیح تعبیر کر سکتی ہیں۔ مثلاً سوشلزم ایک خاص معاشی نظام کی اصطلاح ہے۔ نہ یہ اصطلاح کسی اور نظام کے لئے استعمال ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی اور اصطلاح اس نظام کی صحیح تعبیر کر سکتی ہے۔ اسی طرح نیشنلزم کی اصطلاح ہے۔ اس لئے ہمیں اسلامی نظام اور اس کے مختلف گوشوں کی تعبیر کے لئے اسی کی اصطلاحات استعمال کرنی چاہئیں۔

لیکن اس باب میں ہمارے اربابِ حل و عقد کی جو دشواریاں ہیں ان کا بھی ہمیں احساس ہے۔ مثلاً آپ نے کہا ہے کہ ہمیں "اسلام کا معاشی نظام" کہنا چاہیئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اسے کون متعین کرے گا کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ معاشی نظام تو ایک طرف، یہاں یہی متعین نہیں ہو پایا کہ خود اسلام کیا ہے اور مسلمان کسے کہتے ہیں۔ "اسلام" ہر فرقہ کا الگ الگ ہے —— اس قدر الگ کہ ایک فرقہ کا اسلام دوسرے فرقے کے نزدیک کفر ہے۔ اور مسلمان کی تعریف کے سلسلہ میں حضرات علماء کرام کی طرف سے جو کچھ منیر کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا تھا اس پر ایک زمانہ شاہد ہے۔ یہ وجہ ہے کہ ہمارے اربابِ بست و کشاد "اسلام" کا نام لیتے یا اس کی طرف کسی اسکیم کی نسبت کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ معلوم اسے کیا معنی پہنا دیئے جائیں۔ وہ بیچارے تو مملکت کو اسلامی کہہ کر بھی عجیب مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہر بوالہوس اٹھتا ہے اور چلا چلا کر کہتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ غیر اسلامی ہے۔ حکومت ہمارے حوالے کر دو تاکہ ہم اسے صحیح معنوں میں اسلامی بنائیں۔ اسلام کے ان مدعیان کی حالت یہ ہے کہ سنہ ۱۹۵۶ء کے دستور پاکستان میں یہ شق رکھی گئی تھی کہ ملک میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا

تو انہوں نے شادیانے بجائے کہ مملکت مسلمان ہو گئی ہے۔ لیکن جب ۱۹۶۲ء کے دستور میں لکھا گیا کہ ملک میں کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں بنے گا تو ہنگامہ بپا کر دیا گیا کہ یہ غیر اسلامی ہے۔ اب اس شق کو بدل کر پھر "کتاب و سنت" کے الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں لیکن ان کے نزدیک یہ دستور پھر غیر اسلامی کا غیر اسلامی ہی ہے۔ یہاں تو "اسلام" کو تماشا بنا دیا گیا ہے — اور جب دین مذہبی پیشوائیت کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ اسی طرح تماشا بن جایا کرتا ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس مشکل کا حل کوئی نہیں۔ اس کا حل موجود ہے۔ اور نہایت اطمینان بخش حل۔ یعنی آپ "اسلامی نظام معاشی" کہنے کے بجائے قرآن کا معاشی نظام کہئے۔ بات صاف، واضح اور متعین ہو جائے گی۔ قرآن سے دو قسم کے معاشی نظام مرتب ہی نہیں ہو سکتے۔ اس کا نظام متعین ہے اور اسی لئے اس نظام کی اصطلاحات کے معانی بھی متعین ہیں۔ یہ کیجئے اور دیکھئے کہ کس طرح یہ تمام دشواریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کے لئے سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا مذہبی پیشواؤں کا طبقہ، قرآن کا نام تک سننے کے لئے تیار نہیں۔ یہ اس لئے کہ قرآن کے نام سے ہر بات متعین ہو جاتی ہے اور تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہو جانا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس کتاب و سنت کہنے سے ہر فرقہ کو اپنے وجود کی سند مل جاتی ہے اور مذہب کے خلاف اڈے قائم رہتے ہیں۔

لیکن اس الجھاؤ کو بالآخر ختم کرنا پڑے گا کیونکہ کوئی قوم ذہنی اور نظری انتشار کی حالت میں زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتی۔ یا اسے اس انتشار کو ختم کرنا ہوگا۔ اور یا یہ انتشار اسے ختم کر دے گا۔ اس قسم کے انتشار کو ختم کرنے کے لئے بس ایک عزم راسخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہمیں یہ میسر آگیا تو ہم بچ جائیں گے، ورنہ مذہبی انتشار نے آج تک کسی قوم کو زندہ چھوڑا نہیں۔ اس کے لئے اس صاحب عزم کو کرنا یہ ہوگا کہ زندگی کے ایک ایک شعبے کے متعلق قرآن جو نظام دیتا ہے، اسے واضح اور نکھری ہوئی شکل میں مدون کیا جائے اور پھر اسے مملکت میں بتدریج عملی شکل دی جائے۔ اور اس سلسلے کی اصطلاحات بھی قرآن ہی کی استعمال کی جائیں۔ یاد رکھئے، قرآن اپنا مخصوص نظام رکھتا ہے اور اس میں کسی قسم کے پیوند کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ اس باب میں کس حد تک غیر لچکدار ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے سورۂ محمد کی آیات ۲۵-۲۶ کو سامنے لائیے۔ آیت ۲۵ میں کہا گیا ہے کہ دین سے مرتد کون ہوتا ہے؟ اور آیت ۲۶ میں اس کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں — قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ (۴۷/۲۶) جو ان لوگوں سے جنہیں قرآن سخت ناگوار گزرتا ہے کہتے ہیں کہ ہم بعض امور میں تمہاری اطاعت کریں گے۔ یعنی دین سے وہی لوگ نہیں پھرتے جو دین کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لیتے ہیں۔ دین سے وہ بھی پھر جاتے ہیں جو دین کے نظام میں کسی غیر دینی نظام کا پیوند لگا لیتے ہیں اور اس طرح خدا اور طاغوت میں مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش

کرتے ہیں۔ اسی حقیقت کو اس نے سورہ بقرہ کی اس آیۃ جلیلہ میں دھرایا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہیں اور دوسرے سے انکار کرتے ہیں، انہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و خواری نصیب ہوتی ہے۔ اور آخرت میں بھی عذاب شدید۔ (۲/۸۵)۔ اور اس پیوند سازی کے معنی یہی نہیں کہ آپ ایک بات قرآن کی لے لیں اور دوسری بات (مثلاً) عیسائیت کی یا کسی سیکولر نظام (مثل مغربی جمہوریت یا کمیونزم کی) پیوند سازی یہ بھی ہے ــــــ اور یہ سنگین قسم کی پیوند سازی ہے۔ کہ آپ کچھ باتیں قرآن کی لے لیں اور کچھ باتیں وہ لے لیں جو اسلامی شریعت کے نام سے ہم میں مروج چلی آرہی ہیں لیکن جو قرآن کے خلاف جاتی ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے اس قسم کی پیوند سازی بھی دین سے ارتداد ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت جس اسلام کو پیش کر رہی ہے وہ تو ہے ہی اس قسم کی پیوند سازی جن لوگوں کا عقیدہ یہ ہو کہ اگر کسی معاملہ میں ان کی مروجہ شریعت اور قرآن میں تضاد واقع ہو تو قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھا جائے، ان سے ہاں خالص قرآن کا دین مل کس طرح سے سکتا ہے!

دیکھنا یہ ہے کہ یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے کہ وہ یہاں خالص دین خداوندی (قرآنی نظام) متشکل کر دکھائے۔ یہ شہد خالص اسی کو مل سکے گا جو نہ تو مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے گھبرائے۔ اور نہ ہی ان کی نیش زنی سے خوف کھائے۔　　　وذالک من عزم الامور

بقیہ "لمعات"

سنبھالئے۔ آپ مکان کے رنگ و روغن اور زیبائش و آرائش کی فکر میں ہیں، اور اس کی بنیادیں نیچے سے کھوکھلی ہو رہی ہیں۔ جس قوم کے بچوں کی تعلیم صحیح خطوط پر نہ ہو رہی ہو، اس قوم کی مملکت کی بنیادیں کس طرح مستحکم ہو سکتی ہیں۔ صحیح اسلامی تعلیم، فزکس یا کیمسٹری کی طرح، ایک الگ شعبہ (اسلامیات) میں مقید نہیں ہوتی۔ وہ پورے کے پورے نظام تعلیم کی شریانوں میں خونِ زندگی بن کر دوڑتی ہے۔ مسلمان طالب علم، تاریخ پڑھ رہا ہو یا جغرافیہ۔ ریاضی سیکھ رہا ہو یا فلسفہ۔ فزکس کی ریسرچ کر رہا ہو یا کیمسٹری کی۔ وہ ہر مقام پر یہ دیکھے گا کہ ان علوم کے ماحصل کو کس طرح خدا کی دی ہوئی مستقل اقدار کے تابع رکھ کر انسانیت کے نشوو ارتقاء کے مصرف میں لایا جا سکتا ہے۔ اس کا نام ہے اسلامی تعلیم۔ اگر یہ تعلیم ایسی نہیں تو آپ زیادہ سے زیادہ مُلّا کا ایک جدید ایڈیشن تیار کر سکیں گے، دل و دماغ کے مومن پیدا نہیں کر سکیں گے۔ اور ــــــ اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است

کاتب کی ضرورت

ادارۂ طلوع اسلام کے لئے ایک مستقل طور پر کام کرنے والے اعلیٰ پایہ کے کاتب کی ضرورت ہے جو نستعلیق اور نسخ دونوں میں عمدہ مہارت رکھتا ہو۔ درخواست مع نمونہ بھیجئے، یا خود آکر ملئے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ - بی - گلبرگ - لاہور

حقائق و عبر

۱۔ آہ بیچارے عائلی قوانین

موجودہ حکومت نے جو اصلاحات نافذ کیں ہیں ان میں دو ایک ایسی بھی ہیں جو ہیں قرآن تک نہیں تو قرآن سے قریب ضرور لے آئی ہیں۔ ان میں سے ایک زرعی اصلاح ہے اور دوسرے عائلی قوانین۔ زرعی اصلاحات کا تحفظ تو آئین کے اندر کر دیا گیا اس لئے وہاں ہنگامہ آرائیوں کے لئے گنجائش بہت کم ہے۔ لیکن عائلی قوانین کے ساتھ جو کچھ کیا جا رہا ہے اسے دیکھ کر سوائے اس کے کہ انسان ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جائے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

اول تو عائلی کمیشن کی رپورٹ برسوں تک سیکرٹریٹ میں پڑی رہی۔ صدر مملکت محمد ایوب خاں نے ہمت کر کے اسے وہاں سے نکالا اور اس کی بعض سفارشات کو قانونی حیثیت دیدی تو اس کے خلاف معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ حالانکہ بغور دیکھا جائے تو ان قوانین میں مردوں کے مستبدانہ حقوق جو انہیں ہمارے دور ملوکیت کی شریعت نے صدیوں سے عطا کر رکھے ہیں، بدستور قائم تھے۔ صرف ان کے حصول کے لئے کچھ قواعد و ضوابط مقرر کئے گئے تھے۔ البتہ ان میں ایک بات ضرور داد رسی کی تھی۔ اور وہ یہ کہ یتیم پوتوں کو ان کے دادا کی وراثت سے (مثلاً کی جائداد سے نہیں، ان کے اپنے دادا کی وراثت سے) وہ حصہ دلا دیا گیا تھا جو انہیں خدا نے دیا تھا لیکن جسے مذہبی پیشوائیت نے صدیوں سے غصب کر رکھا تھا۔ بہرحال ان قوانین کے خلاف ہنگامہ آرائی کی گئی اور بڑے زور شور سے کی گئی۔ اس میں نہ "کتاب و سنت" کی بات تھی، نہ شریعت کے احترام کا سوال۔ سوال صرف مذہبی پیشوائیت کی جھوٹی عزت الاثم (FALSE PRESTIGE) کا تھا۔ وہ کہتے یہ تھے کہ جب ہم (جو شریعت کے ٹھیکیدار ہیں) کہتے ہیں کہ یہ قوانین اسلام کے خلاف ہیں تو اس کا کسے حق پہنچ سکتا ہے کہ وہ کہے کہ یہ اسلام کے خلاف نہیں۔ چنانچہ ان کی مخالفت اسی تحکمانہ انداز سے کی گئی۔

حتٰی کہ مغربی پاکستان کی اسمبلی نے ان کی تنسیخ کے حق میں قرارداد تک پاس کر دی۔ لیکن پھر قوتِ بازوئے ایوب کام کر گئی اور مرکزی اسمبلی نے انہیں بحال رکھا اس کے بعد معاملہ کچھ وقت کے لئے ٹھنڈا پڑ گیا۔ لیکن اب جو الیکشن کی وبا پھوٹی تو اس میں پھر یہ قوانین سامنے لائے گئے۔ چنانچہ حزبِ مخالف نے اپنے انتخابی منشور میں یہ شق رکھدی ہے اگر ہمیں " اللہ کے فضل و کرم سے " کامیابی ہو گئی تو ہم ان قوانین کو' جو اللہ کی کتاب کے نسبتاً قریب ہیں' منسوخ کر کے دکھائیں گے۔ اس کے خلاف سب سے پہلی صدائے احتجاج محترمہ بیگم شاہنواز کی طرف سے اٹھی جنہوں نے اسی بنا پر کونسل مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ سے استعفٰی دے دیا۔ اب ۲۸ ستمبر کو معلوم ہوا ہے کہ متحدہ حزبِ مخالف کی ایک پارٹی نے کہا ہے کہ ہم بھی منشور کی اس شق کے مخالف ہیں۔ گویا یہ غریب کی جورو' بیچاری پھر بدِ کشمکش ہو رہی ہے۔ دوسری طرف سننے میں آیا ہے کہ مرکزی اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں کوئی مسودۂ قانون پیش کیا جائے گا جس کی رُو سے ان قوانین کی ان تمام شقوں کو جو مولوی صاحبان کے نزدیک خلافِ شریعت ہیں' کالعدم قرار دیدیا جائیگا۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں سب سے پہلی زد یتیم پوتوں کی وراثت سے متعلق شق پر پڑے گی۔ پھر طلاق اور تعددِ ازدواج سے متعلق شقوں پر۔ یعنی ان قوانین میں جو دو تین باتیں بھی ذرا قرآن سے قریب لاتی تھیں وہیں خلافِ شریعت قرار دے کر منسوخ کر دیا جائیگا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی - شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

ہم یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور حیران ہیں کہ یا اللہ! اس قوم کا بالآخر بنے گا کیا؟ اس نے یہ خطۂ زمین اس لئے حاصل کیا تھا کہ یہاں صحیح قرآنی قوانین نافذ کئے جائیں گے اور حالت اس کی یہ ہے کہ یہ قوانین' جو کاملتہً قرآنی بھی نہیں بس قرآن سے نسبتاً قریب ہیں وہ بھی بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح دستِ گرداب ہیں۔ پھر تماشا یہ ہے کہ اس مملکت کے دستور میں یہ لکھا ہے کہ یہاں کوئی قانون " کتاب و سنت " کے خلاف نہیں بنے گا - اس اصول کا تجزیہ کر کے دیکھئے۔ بات کس قدر واضح ہو جاتی ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ آپ نے اپنی کسی اسکیم کے متعلق طے کیا ہے کہ وہ اس صورت میں نافذ العمل ہوگی اگر اُسے زیدؔ اور عمرؔ دونوں منظور کر لیں۔ آپ اس کی بابت زیدؔ سے پوچھتے ہیں۔ وہ اسے نامنظور کرتا ہے۔ اس کے بعد اس امر کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ عمرؔ سے بھی دریافت کیا جائے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ یہی صورت کتاب و سنت کی مطابقت " کی ہے۔ آپ ایک قانون بنانا چاہتے ہیں جس کی اجازت قرآن نہیں دیتا۔ اس کے بعد اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ آپ کاوش کریں کہ سنت اس کی بابت کیا کہتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ "قانون قرآن کے مطابق ہے لیکن سنت اس کے خلاف جاتی ہے تو ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ وہ سنت رسول اللہ کی ہو نہیں سکتی۔ اس لئے کہ حضورؐ قرآن کا اتباع کرتے تھے۔ (معاذ اللہ) قرآن کے خلاف نہ کچھ کہہ سکتے تھے نہ کر سکتے تھے۔ بریں ایک اسلامی مملکت میں

قانون سازی کا بنیادی معیار اور اصول قرآن کریم کی مطابقت ہے۔ ہم حضرات علماء کرام اور ان کے دیگر ہم نوا احباب کو چیلنج دیتے کہ وہ ثابت کریں کہ موجودہ عائلی قوانین کی کوئی شق قرآن کریم کے خلاف ہے اور اگر صورت یہی ہے کہ ان کی کوئی شق قرآن کے خلاف نہیں تو پھر ان کی مخالفت کے کیا معنی؟ لیکن ان حضرات کا تو بابا آدم ہی نرالا ہے (مثلاً) یتیم پوتے کی وراثت کے سلسلہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کہتے ہیں۔

> فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا۔ بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جاسکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے اُمت خلف سے سلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔

سوال یہ ہے کہ

(۱) دستور پاکستان کی رو سے یہاں وہی قانون جائز قرار پا سکتا ہے جو کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو۔

(۲) مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق کتاب و سنت میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں جو یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے محروم کر دے۔

(۳) لہٰذا وہ قانون جس کی رو سے یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے حصہ ملتا ہے۔ دستور پاکستان کی رو سے بالکل جائز قانون ہے۔ اس قانون کی مخالفت، خود آئین پاکستان کی مخالفت ہے۔

اور اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ جب یتیم پوتے کی وراثت کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا، تو وہ کون ہے جو اسے حرام قرار دیدے؟ یہ تو خدائی اختیار کو اپنے ہاتھ میں لے لینا ہے! خدا نے تو اپنے رسولؐ تک سے کہہ دیا تھا کہ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (۶۶/۱) جس چیز کو خدا نے حرام نہیں قرار دیا، تم اسے حرام کیسے قرار دے سکتے ہو؟ لیکن یہاں ہم سے کہا جاتا ہے کہ جس چیز کو خدا نے ناجائز نہیں قرار دیا، فقہاء اُمت اسے ناجائز قرار دے سکتے ہیں! یا للعجب۔ کیا ان میں سے کوئی صاحب بتائیں گے کہ خدا نے فقہائے امت کو یہ اختیارات کہاں تفویض کیے ہیں؟ اس نے تو اس کے برعکس

(بقیہ صفحہ ۳۲ پر)